اخترستان

از
اختر شیرانی

کتاب منزل لاہور

اخترستان

اختر شیرانی کی نظموں کا دُوسرا مجموعہ

ناشران
کتاب منزل لاہور

طبع اوّل

سنہ ۱۹۴۶ عیسوی

شیخ نیاز احمد پروپرائٹر و پبلشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجرانِ کتب مالکان کتاب منزل

کشمیری بازار لاہور نے

آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں سردار پریم سنگھ

پرنٹر کے اہتمام سے چھپوا کر کتاب منزل کشمیری بازار لاہور سے شائع کی +

مندرجات

چہرہ نما

ہر نظم گوہریں کہ بیادِ تو گفتہ ام
دل رخنہ کردہ و جگرِ خویش سُفتہ ام

(ملک الشعرا فیضی)

نذر

”ع“

زلف آشفتہ و خوے کردہ و خنداں لب و مست
پیرہن چاک و غزلخوان و صراحی در دست

نرگسش عربدہ جوی و لبش افسوس کناں
نیم شب مست ببالینِ من آمد بنشست

سر فرا گوش من آورد بآوازِ حزیں
گفت کاے عاشقِ شوریدۂ من خوابت ہست!

عاشقے را کہ چنیں بادۂ شبگیر دہند
کافرِ عشق بود گر نبود بادہ پرست!

”خیز و یک جام دگر گیر کہ باید نوشید“
اگر از خمرِ بہشت است وراز بادۂ مست

خندۂ جام مے و زلفِ گرہ گیرِ نگار
اے بسا توبہ کہ چوں توبۂ حافظ بشکست!

چند لمحے اختر شیرانی کے ساتھ[1]

ایک مقالہ جو گورنمنٹ کالج کی مجلس اردو میں پڑھا گیا

از کپتان ن ۔ م راشد ایم ۔ اے

جن لوگوں نے اختر شیرانی کا نام سنا ہے ۔ ان کے دل میں اس نام کے ساتھ ایک اور نام بھی ویسی ہی اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ نام اختر کی شاعری کی روح ہے ۔ اسی ایک نام سے تخیل کی رومانی آوارگی کے باوجود اُن کی شاعری میں زندگی دھڑکتی ہے ۔ یہ نہ صرف اُن کی حیاتِ عشق کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتا ہے بلکہ ہمیں اس زندگی کی تمام ارتقائی منزلوں سے بھی گزارتا چلا جاتا ہے ۔

میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے اس سوال کا جواب دے دوں جو اختر کے ہر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یعنی سلمیٰ کیا ہے ؟

میں نے براہ راست حضرت اختر سے یہ سوال کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی ۔ اُن کے سامنے میری حیثیت ایک ڈرپوک طالب علم کی سی رہی ہے ۔

اختر نے اس لفظ کو اپنی اکثر عشقیہ نظموں میں اس خلوص اظہار کے ساتھ استعمال کیا ہے گویا اُن کی تمام شاعری کسی ع "عشقِ رسوا کی داستانِ خموش"

---

[1] اس مقالے کی حیثیت مقدمے کی نہیں ہے نہ یہ سارے کلام کے مطالعہ کا نتیجہ ہے مگر دلچسپی کے لحاظ سے ہم شائع کر رہے ہیں (ناشر)

کے سوا کچھ نہیں ۔ اور اُن کی ہر نظم ایک حقیقی رومان کی حامل ہے ۔ جو کبھی شاعر کے طربیہ خیالات سے پُر ہوتا ہے اور کبھی یاس انگیز احساسات سے۔

سلمیٰ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک Ideal یا نصب العین تھا جس تک اختر پہنچنا چاہتے تھے اور شاید اب بھی اُن کا دل اس ذوق سے محروم نہیں ہوا۔

غالباً اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ اردو شاعروں کا نصب العین ایک شاہدِ بازاری رہا ہے ۔ اور اردو شاعر ایک ہوس کارانہ انداز میں اس مجلس کے محض ایک رکن ہونے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو لا انتہا عشاق پر مشتمل ہوا کرتی تھی ۔ وہ اس نصب العین تک اس لئے پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے تھے کہ وہاں انہیں اپنے جذبات کا کوئی عکس یا شیلے کے الفاظ میں antitype نظر آتا تھا بلکہ صرف اس لئے کہ شعر کہنے کے لئے ایک معشوق ضرور ہونا چاہئے۔

موجودہ دور کے ایک دو شاعروں نے اس معشوق کو ایک دوست کی شکل میں دیکھنا پسند کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ مشرقی نقطہ نظر سے یہ لفظ بہت ہی شعریت نا آشنا ہے ۔ اگر یہ لفظ محبوب کا مترادف قرار دے لیا جائے تو شاعری اخلاقی حدود سے کبھی نہیں بڑھ سکتی۔

اختر کی شاعری میں یہ دونوں باتیں نہیں ۔ ان کی نغمہ نوازی کا منتہا سلمیٰ ہے یعنی ایک عورت! اور عورت کے متعلق وہ اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں ؎

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت مست ہو کر مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو بزمِ کہکشاں کو نیند آتی ہے

گوئٹے نے کہا تھا کہ محبت اور درد کا جذبہ کائنات کی ہر شئے میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا جیتا جاگتا نمونہ عورت کی ذات ہے۔"

اختر کے ہاں عورت ایک قوت بھی ہے ؎

وہ چاہے تو الٹ دے پردۂ دنیائے فانی کو — وہ چاہے تو مٹا دے جوشِ بحرِ زندگانی کو
وہ چاہے تو جلا دے نخلِ زارِ حکمرانی کو — وہ چاہے تو بدل دے رنگِ بزمِ آسمانی کو
وہ کہہ دے تو بہارِ جلوہ مٹ جائے نظاروں سے
وہ کہہ دے تو لباسِ نور چھن جائے ستاروں سے

انسان کی اس صنف سے اُن کی سلمیٰ تعلق رکھتی ہے۔ گویا ایک عورت کو اپنی نغمہ سنجی کا منتہا اور بقول خود "افکار کی معبود" بنا کر اختر اُن فطرتی اصولوں کی حمایت کر رہے ہیں جن سے اردو کے قدیم شاعر نا آشنا تھے کیٹس نے حُسن کو صداقت کے ہم معنی قرار دیا تھا حُسن کا احساس کچھ ماورالطبیعی (Metaphysical) سا ہے کچھ صوفیانہ سا۔ مگر اختر کے لئے حُسن کا دوسرا نام سلمیٰ ہے۔ ورڈز ورتھ (Wordsworth) اس مشہور دیہاتی کو یہ حُسن، لوسی کی صورت میں نظر آیا۔ اور مظلوم کیٹس کے لئے اُس نے فینی براؤنی (Fanny Brawne) کی شکل اختیار کر لی مگر سلمیٰ نہ تو بوڑھے ورڈز ورتھ کی کمسن لوسی ہے (کہا جاتا ہے کہ ورڈز ورتھ گہرے جذبات سے عاری تھا اُس کی لوسی کا بھی یہی حال ہے) اور نہ کیٹس کی فینی براؤنی کی طرح حد سے زیادہ بیدادگر۔ سلمیٰ نغمہ، شراب، شعر اور جوانی کا ایک خیالی مجموعہ سمجھ لیجئے جس کا بیرونی پردہ انسانی پیکر کا سا ہے۔ اختر لکھتے ہیں ؎

بہارِ حُسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ!
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے — بہشتِ رنگ و بُو کا تو سراپا اک نظارا ہے
تری صورت سراپا پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ — ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارا ہے — تو اس دنیا میں بحرِ حُسنِ فطرت کا کنارا ہے

تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

جہانِ قدس کا تو ایک نورانی فسانہ ہے
تجھے سلمیٰ دیارِ ناز کی اک ساحرہ کہئے   صنم آبادِ عفت کی مقدس کا فرہ کہئے
ربابِ حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے!
پرستانِ لطافت کی تو اک رنگیں کہانی ہے   جوانِ فطرت کا تو اک گمشدہ خوابِ جوانی ہے

میرے خیال میں اگر میں کسی طرح سلمیٰ کی توضیح اس سے بہتر طور پر کرنا چاہتا تو میرے لئے کامیابی ناممکن تھی۔

میں نے کہا تھا کہ سلمیٰ ہی اختر کا نصب العین ہے۔ اختر کے الفاظ میں وہ بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے جس تک پہنچنے کے لئے اُن کی روح بیتاب رہتی ہے۔

اختر کی بعض نظموں مثلاً "سلمیٰ سے دل لگا کر" اور "ایک خاتون کی شادی پر" میں سلمیٰ ایک جیتی جاگتی سادہ لڑکی نظر آتی ہے جس سے شاعر محبت کرتا ہے اور جو شاعر سے محبت کرتی ہے۔ لیکن بالآخر ہندوستان کی معاشرتی قیود کی وجہ سے شاعر سے ہمیشہ کے لئے جدا رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے لیکن سلمیٰ درحقیقت حسن۔ جوانی۔ نور نغمہ۔ رنگ کیف سحر اور لطافت کے ایک پیکرِ خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ شاعر نے اسے ایک بار کہیں دیکھا ہے۔ اس کے جلووں سے فطرت کے مناظر چاند ستارے۔ باغ۔ نہریں۔ سبزہ زار وغیرہ نے کئی بار حظ اُٹھایا لیکن شاعر کی نگاہ اُسے پھر کبھی نہیں دیکھ سکی۔

چنانچہ سلمیٰ اختر کے لئے ایک جمالِ ذہنی ہے وہ جمالِ ذہنی جس کو مخاطب کر کے ٹینیسن نے ایک گیت گایا تھا۔ اختر بعض اوقات اس کے پیچھے بخار کی سی حالت میں آہیں بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظموں "چلی گئیں"، "حسرتِ دیرینہ"، "گزارش" اور "ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے

کی ہوس ہے" میں یہ احساس سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اُن کی نظم "اُن سے" بھی جسے عہدِ حاضر کا واسوخت کہنا چاہئے۔ انہیں آہوں سے بھری ہوئی ہے لیکن مذکورۃ الصدر نظموں کی نسبت اس کی ادبی حیثیت پست ہے۔ اختر بعض اوقات اس حُسنِ مطلق کے بہت ہی قریب ہو کر فرطِ مسرت سے جھوم جاتے ہیں۔ وہ مسرت بذاتِ خود ایک اضطراب ہوتی ہے یا شیلے کے الفاظ میں "وہ اضطراب جسے غلطی سے لوگ مسرت کہتے ہیں"۔

اس مسرت یا اضطراب کی بہترین آئینہ دار اُن کی نظم "گجرات کی رات" ہے اور کسی حد تک اُن کا سانیٹ "ایک تصویر کو دیکھ کر" بھی۔ مگر اس کے خلاف سلمیٰ سے دُور رہ کر یا دُور ہونے کے خیال سے اُن پر ایک بے بسی کا احساس ایک غیر مآل اندیشانہ یاس کا جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ اُن کا ایک شعر ہے ؎

تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
دل و دماغ کو رو لوں گا، آہ کر لوں گا

اس سے زیادہ Despair اس شعر میں ہے ؎

میں اپنی عمر کو صرفِ گناہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے

یا ؎

یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا
ہو کے ناکام ہوس کار بنے کیوں اختر

میرے خیال میں ناکام ہو کر ہوس کار بن جانا اس Despair کا عملی اظہار ہے۔ جو حسرت موہانی کے الفاظ میں "شوق کی بلندی" اور "ہمتوں کی پستی" کی بیک وقت موجودگی میں انسان پر طاری ہوتا ہے۔ اسی بے بسی کا احساس اُن کے ایک اور شعر میں بھی ہے جس کا سلمیٰ سے کوئی تعلق نہیں ؎

یہ سیلِ نور ستم ہے شراب ہو نہ سکا
ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی

اختر کی شاعری میں سلمیٰ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہتا

ہوں کہ سلمیٰ اختر کے لئے کسی طرح بھی روحانی مرکز عقیدت کے مترادف نہیں اختر کی شاعری فلسفہ اور تصوّف سے دُور ہے۔ اُن کی سلمیٰ اسی مادی دنیا کی مخلوق ہے۔ وہ اُن کے ذہن کی مفروضہ "فوق النسا" ضرور ہے لیکن وہ ایسی نہیں جس کی محبت کو وہ کسی ماورا الطبعی منزل کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہوں۔ اس کا عشق اُن کے لئے نہ صرف اپنی آپ ابتدا ہے بلکہ انتہا بھی۔ برسبیل ذکر انہوں نے شاید عمر بھر میں ایک نیم فلسفیانہ سا شعر کہا ہے؎

زندگی کی حقیقت آہ نہ پوچھ　　　موت کی وادیوں میں اک آواز

اس شعر کو چھوڑ کر اُن کی باقی تمام شاعری ایک نہایت وجد انگیز غنائیت سے معمور ہے، جو کبھی الفاظ کی ترتیب سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی اُن کی انفرادی رنگینی سے۔ اُن کا عشق اگرچہ اردو کے ہر شاعر کے ادعا کے مطابق "ہوس" سے پاک ہے لیکن اس میں عضوی لذات کے احساس کی کمی نہیں۔

اختر کا عشق ارضی ہے۔ بالکل مادی عشق ——— اور یقیناً وہ عشق نہیں جسے مجاز کہہ کر نام نہاد حقیقت کا زینہ سمجھا جاتا ہے اور ہٹ دھرمی کی حد تک اس کی دُور از کار تشریحیں بیان کی جاتی ہیں۔ اسے تصوّف اور معرفت کے بےکیف رنگوں میں رنگنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے مبہم پوشیدہ مطالب نکالنے کی سعی لاحاصل! اختر کا عشق ایک حساس اور نوجوان شہری کا دنیاوی عشق ہے۔ الوہیت اور روحانیت اس کے لئے بےمعنی الفاظ ہیں ——— اختر کا تخیل اسی عشق سے سرشار ہے۔

سلمیٰ کی اصلی حیثیت پہلے واضح کر چکا ہوں۔ یہ لفظ بذات خود عربی شاعری سے مستعار ہے۔ اس لفظ کی موجودگی سے اختر کے بعض تخیلی افسانوں میں بھی واقعیت کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ اور عرب شعرا کی آوارگی اور نغمہ پسندی بھی بعض وقت اُن سے جھلک اٹھتی ہے۔ جو اُن کی نظموں کو اور زیادہ رومانی Romantic بنا دیتی ہے۔ اختر نے اپنی نظموں

ہیں اگرچہ سلمیٰ کے متعلق بہت سی تخیلی باتیں بھی لکھی ہیں لیکن سلمیٰ ہرگز غیر ارضی ہستی نہیں۔ اگر سلمیٰ کی محبت اختر سے چھین لی جائے تو اُن کے نغمے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں۔ اسی محبت سے اُن کے دل کے تاروں میں لرزش ہے۔ اختر کی شاعری ایک غیر مطمئن امنگ ہے ایک فریاد ہے۔ اس ارضی زندگی کی تمام صلاحیتیں جذب کرنے کے لئے حسن اور موسیقی کی پرستش میں فنا ہو جانے کے لئے۔ اور عشق کی غم آلود مسرتوں میں کھو جانے کے لئے جو بعد میں بہت زیادہ خلش انگیز بھی ثابت نہ ہوں کیٹس کا مشہور نظریہ کہ "حسین چیز ابدی مسرت ہے"۔ شاید اختر کی پرستشِ حسن کا راز حل کر سکتا ہے۔

اُن کی دنیائے مسرت کے تعمیری عناصر یہ ہیں۔ سبزہ زار۔ سبزہ زاروں میں بہار، کلیاں اور مرمریں پھول۔ چاندنی رات۔ پُر خواب فضائیں اور محض خیال انگیز سا۔ عشق کی سخت ترین خلشوں سے تنگ آکر بھی اختر کا جی رونے کو نہیں چاہتا۔

یہ وہ دُنیا ہے جس کو اختر اپنی عاشقانہ آوارگی کی جولانگاہ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس آوارگی کے سلسلے میں خود گلا پھاڑ پھاڑ کر گانا پسند نہیں کرتے جیسا کہ عشاق کا قاعدہ ہوتا ہے۔ اس فضا میں اُن کی آرزو ہوتی ہے۔ کوئی جوگن ہو جو آہستہ آہستہ "موسیقی خیز کے دریا" بہاتی رہے۔ پھر وہ ستار اُٹھا کر چل دے تو اس کے رسیلے نغمے فضاؤں میں تیرتے رہیں۔ یا کوئی جوگی اپنی ابھری بنسی سے دردِ فراق کی خاشیوں میں ڈوبی ہوئی تانیں اُڑائے۔ یا رات کی پریوں کی پھڑپھڑاہٹ سے نغمے گر کر فضا میں معلق رہ جائیں اور اس دنیائے مسرت میں حُسن کی تمثیل خارجی، سلمیٰ کی خاموش موجودگی اس دنیا کا اہم ترین جزو ہے۔ اسی دنیائے مسرت تک اسی جولانگاہِ جنون تک پہنچنے کی آرزو ایک مسلسل کاوش و کاہش بن کر اختر کے دل میں جاگزیں رہتی ہے۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی امنگیں ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں اُن کی سب سے مشہور نظم "اے عشق کہیں لے چل" میں اسی دنیا تک پہنچنے کے لئے چیخیں

ہیں۔ وہ لدوز فریادیں ہیں۔ وہ "عشق دیوتا" سے التجا کرتے ہیں کہ وہ انہیں اُن کی سلمیٰ کی معیت میں اس "تیرہ زار زیست" کے اُس پار اُس ذہنی دنیا میں لے جائے۔ اس نظم میں بہت حد تک وہی خیالات ہیں جنھوں نے غالب کی زبان سے کہلوا دیا تھا۔ ع

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اُن کی ایک اور نظم "شاعر" میں یہی احساسات ہیں لیکن ان احساسات کے ساتھ اس دنیا سے بیزاری کا جذبہ بہت زیادہ شدت سے موجود ہے جس میں فارسی اور اردو کے پرانے شعرا کے بے ثباتی دنیا کے شکووں کا ہلکا سا عکس بھی نظر آتا ہے۔

اُن کی نظم "اک سرزمینِ عشق ہے" بھی انہیں خیالات کی حامل ہے کہ اس دنیا سے علیحدہ ایک غیر محسوس دنیا ہے جو اختر کے الفاظ میں "دیوتائے عشق کی پرواز سے لبریز ہے"۔ عشق اُن کی اس تخیلی دنیا کا ناگزیر عنصر ہے۔ اس کے بغیر اس دنیا کے مناظر بے رنگ و کیف رہ جاتے ہیں۔ اس ذہنی دنیا کو ایک مقام پر انہوں نے "حریمِ حضرتِ سلمیٰ" بھی کہا ہے ؎

حریمِ حضرتِ سلمیٰ کی سمت جاتا ہوں ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کر لوں گا

بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ حضرت اختر سرزمین گجرات کے اس قدر دلدادہ کیوں ہیں؟ کیا اس کے ساتھ واقعی اُن کی زندگی کے بعض واقعات وابستہ ہیں؟

شاید اُن کی زندگی کے بعض واقعات اس سے وابستہ ہوں میں نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اُن کی ذہنی دنیائے مسرت کا فرضی نام گجرات ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں ان کا منصورہ حسن مرکوز ہے گجرات انہیں اس لئے بھی عزیز ہے کہ اس کی فضاؤں میں تہمنی کے دلگداز نغمے ابھی تک گونج رہے ہیں اور چناب کی موجیں دھیمے سُروں میں اس کے آخری گیت دہرا رہی ہیں جس طرح ورڈزورتھ نے کہا تھا کہ "اب بھی جب کبھی آندھی چلتی ہے تو اُس میں

؎ افسوس کہ یہ نظم تلاش کے باوجود نہیں مل سکی (ناشر)

لوسی کے چھینے کی آواز آتی ہے۔

دریا پہ ہیں پریشاں وہ دلگداز نغمے — وہ سوزِ عاشقی کے شعلہ طراز نغمے
نغمے! وہ مستِ کیفِ ناز و نیاز نغمے — پُرسوز و سازِ نغمے، اے سرزمینِ گجرات
موجوں کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی ہے — یا روحِ سوہنی کی دریدہ گا رہی ہے
اور دردِ عاشقی کے نغمے سنا رہی ہے — آنسو بہا رہی ہے اے سرزمینِ گجرات

کون جانتا ہے کہ وہی سوہنی ہیکیہ بدل کر اختر کے لئے سلمیٰ بن گئی ہو۔ اختر کی شاعری سے ایسے آثار بھی ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلمیٰ خود بھی اختر کے لئے سوہنی کی طرح ویسا ہی درد و کرب اور ویسی ہی خلش محسوس کرتی ہے۔ اور اردو کے قدیم شعرا کے محبوبوں کی طرح ظالم و بیداد گر نہیں۔

اختر ایک جوان شاعر ہیں۔ بہت ہی جوان شاعر! اُن کی تمام تر شاعری پر ایک جوانی چھائی ہوتی ہے اُن کی اس جوان روح کی بہترین مظہر اُن کی نظم "جوگن" ہے اور اس کے بعد "کلیاں"۔ مگر موخرالذکر نظم کے آخیر پر بھی اُن کے خیالات اُسی مضطرب آرزو کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو اس دُنیا کو چھوڑ کر کسی اور دُنیا میں پہنچنے کے لئے ہر وقت اُن کے دل میں رہتی ہے ؎

مرا بس ہو تو میں اختر انہی کا رنگ ہو جاؤں — ہمیشہ کے لئے ان چمپئی پردوں میں سو جاؤں
مجھے اُن کی رسیلی گود میں مرنے کی حسرت ہے — مجھے تو کچھ انہیں پیاری کلیوں سے محبت ہے

ایک اور نظم میں انہیں خیالات کی گونج ذرا غیر مترنم انداز میں موجود ہے ؎

یہ آرزو ہے اختر اب کہ مر کے اُن کے رنگ و بو میں سو رہوں

مرا مزار ہو سرائے گل۔ مرا کفن بنے قبائے گل

ایک سانیٹ جس میں سلمیٰ کو مخاطب کیا ہے اُس کے اختتامی مصرعے ہیں ؎

ادا اس طرح فرضِ دوستانی کچھ تو کر جاؤں — تری تصویر سینے سے لگالوں اور مر جاؤں

متذکرہ بالا مثالوں میں وہ آرزو جو آج تک تشنۂ تکمیل ہے صرف اس دنیا سے کسی اور حسین دُنیا

میں جانے کی آرزو ہوکر نہیں رہتی بلکہ یہاں وہ سرزمین عدم سے ہمکنار ہونے کی آرزو بن جاتی ہے۔ اختر کلیاں اور سلمٰی کی تصویر دیکھ کر فرطِ مسرت سے آنکھیں بند کر لینا چاہتے ہیں۔ یہ وفورِ مسرت ایک حظ اور بے پناہ لذت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور شاید تحت شعوری احساس کہ اس ہنگامی لذت کے فرو ہونے کے بعد شاعر کے لئے زندگی کی تلخیاں ہونگی، اُسے موت کی آرزو کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مگر یہ موت کی آرزو کچھ افادی سی ہے اور خاص مقصد رکھتی ہے یعنی وہ ایسی موت چاہتے ہیں جو انہیں ایک مسرتِ بیکراں ہیں اور ایک لذتِ جاوید میں غرق کر دے۔ "کلیاں" کے آخری بند میں تو شیلے کی اُس غم آلود ترنگ کی گونج ہے جو اُسے فطرت کے ساتھ ایک ہو جانے کے لئے اُکسایا کرتی تھی۔

شاید ان خیالات کو اس دُنیا سے بزدلانہ گریز تصور کر لیا جائے۔ مگر ایک حُسن مجسم کی آرزو انہیں غیر شعوری طور پر قدرت کی کارگاہوں کی تلاش پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ ہر حال میں اس صنم آبادِ عفت کی مقدس کا فرہ" کے دیار تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اختر کا سانیٹ "دُنیا کی بہاریں" ہر چند ایک آہنگ بحر کی وجہ سے نسبتاً بے کیف سہی لیکن اس کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ ان کا منتہائے نظر یہ دُنیا ہو یا کوئی اَور اخذِ لذت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اُن کی یہ روحِ شباب بعض نظموں میں جنسی خواہشات کی تسکین کی ہلکی سی کوشش بن جاتی ہے، ان کے لئے حسن کاری اور تصویر کشی کے موقعے پر یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے اور عوام اسے عریاں نویسی پر محمول کرنے لگ جاتے ہیں۔ اختر اپنی نظم "لیلائے شب" میں لکھتے ہیں ؎

سیاہ ساری پہ سینکڑوں زر فشاں ستارے جڑے ہوئے ہیں
جو اُس کے گلفام جسم کو اپنی ظلمتوں میں چھپا رہی ہے !

اور ؎

جو کھل گئی پوری ساری لے لے گا گود میں آفتاب اُس کو
سنہری کرنوں کی روشنی کا ملیگا زرّیں نقاب اُس کو

اُن کی نظم "جوگن" میں یہ "دماغی عیاشی" اور زیادہ عریاں نظر آتی ہے ؎

آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں — دوشیزگی کی گنگا طوفان اُٹھا رہی ہے

اختر کی ایک اور نظم "حُسنِ معصوم اور اس کی محافظ حور" ہے جو اُنہوں نے شاید ایک تصویر دیکھ کر کی تھی اُس میں لکھتے ہیں ؎

وہ اُس کی معصوم سادگی سی وہ اُس کا چہرہ گلاب کا سا — وہ کچھ رسیلی کنول سی آنکھیں وہ اُن میں نشہ شراب کا سا

وہ اُس کی مبہوت بے حجابی وہ اُس پہ عالم حجاب کا سا — وہ اس کی شاداب کمسنی اور وہ اُس کا نقشہ شباب کا سا

اس نظم میں اس شباب کے ساتھ معصومیت کا احساس مل گیا ہے۔ ورنہ میرے خیال میں اس کی تمام ترکیبوں میں لذت اندوز جذبات کا اظہار کسی طرح کم نہیں۔

اس جوانی کا مظاہرہ ان کی بعض نظموں میں لا ابالیت کی صورت میں ہوتا ہے اور جس کو ہم اس دنیا سے فرار یا گریز سمجھ لیتے ہیں وہ ایک نوجوان کی لا ابالیت بن جاتی ہے۔ کسی نے کہا تھا "جوانی میں ہر شخص عاشق ہوتا ہے یا اپنے آپ کو عاشق فرض کر لیتا ہے"۔ اس عشق کے ساتھ ایک عجیب قسم کی جنون آمیز لا پروائی سی آجاتی ہے۔ اختر کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

تم کو اختر بھی یاد ہو شاید — کھویا کھویا سا وہ جوان خموش

اختر بعض اوقات بہت شاعر نہیں ہیں۔ وہ اپنے لئے مسرت کے خواب دیکھتے ہیں لیکن بعض لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ مسرت کا انتہائی دور اسی طرح غم میں تبدیل ہو جاتا ہے جس طرح ایک بہت زیادہ میٹھی چیز کڑوی ہو جاتی ہے۔ وہ اس خوشی میں کہ دیوتائے عشق کی معیت میں اپنی خیالی "بہشت آئین وادی" میں جا رہے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی انہی انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں جن کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ اس وقت اُن کے دل میں ایک فریب آمیز خودی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ سرزمین جس سے اُن کی "پریم نیا" آہستہ آہستہ ہٹتی جا رہی ہے اور جو ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو رہے ہیں، انہیں "جذبات کے مقتل" اور "آرزوؤں کے مدفن" نظر آتے ہیں اور اُن کی تباہی

ہوئی بستیوں کے انسان خدا کی ذلیل تریں مخلوق ۔

اس نظم میں اُنھوں نے انسانوں کو "مکرو دغا پیشہ حیوان" کے نام سے یاد کیا ہے۔

ایک اور نظم میں اسی قنوطیت کی مدد کے لئے اخلاقی جذبات بھی نمودار ہو جاتے ہیں ؎

روح کے گلکدے ویران ہوئے جاتے ہیں ــ شیطنت کاری کے سینے مسکن
دل کے شورش کدے سنسان ہوئے جاتے ہیں ــ اور جذباتِ وفا کے مدفن !
ذوق، بیگانہ عرفان ہوئے جاتے ہیں ــ اور منزل گہِ صد اہرمن
جو تھے انسان وہ حیوان ہوئے جاتے ہیں ــ آہ او سفلگی چرخِ کہن !

مجھے بعض دفعہ یہ خیال آتا ہے کہ کچھ عرصے سے حضرت اختر نے گناہ کے خلاف جو جنگ شروع کر رکھی ہے یہی شاید اُن کے منتشائم خیالات کی محرک ہو یا ممکن ہے اُن کے منتشائم خیالات ان کی اس جنگ کے محرک ہوں ۔ ان کی ایک مستزاد "شہر دل کی ویرانی" نہ صرف گناہ کے خلاف اس جنگ کی آئینہ دار ہے بلکہ امارت کے خلاف اظہار نفرت بھی ؎

نوحہ زارِ عبرت ہے شہر دل کی ویرانی ــ روح کی پریشانی
ظلمتوں کی وادی میں گم ہے شمع عرفانی ــ نورِ فکرِ انسانی
شوق ہے عمارت کا کائنات میں اب بھی ــ شش جہات میں اب بھی
خندہ زن ہیں انجم پر کاخہائے سلطانی ــ رشکِ باغِ رضوانی
بے چراغ لیکن روح و دل کے ایواں ہیں ــ تیرہ ناک و ویراں ہیں
ظلمتوں میں خوابیدہ ہے دیارِ انسانی ــ جلوہ زارِ انسانی

مجھے اعتراف ہے کہ اس مستزاد کی غیر مانوس بحر اور حد سے زیادہ اخلاقی لب و لہجہ نے اس کے اثر کو تباہ کر دیا ہے ۔ یہ نظم مجھے کبھی پسند نہیں آئی ۔ مگر اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ امیرانہ شان و شوکت اور کاخہائے انسانی کی تعمیر کے ذوق کو اختر کسی اشتراکی زاویۂ نگاہ

سے قابلِ نفرت نہیں سمجھتے بلکہ اُن کے سامنے یہ اخلاقی مقصد ہے کہ شہروں کی ویرانی اور جوانی کی تقدیس کی تباہی کے بعد شوقِ تعمیر یعنی امیرانہ تفاخر کسی صورت میں پسندیدہ نہیں۔

اُن کی ایک نظم "ایک حُسن فروش سے" پڑھنے کے بعد غالباً گناہ کی ہیبت کا احساس اور زیادہ سختی سے ہوتا ہے۔ اس نظم کے محرک بہت حد تک وہی جذبات ہیں جو حفیظ کی رقاصہ کے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ حفیظ کی نظم کا تعلق معاشرت سے ہے اور اختر کی نظم صرف اُن کی اپنی ذات اور اپنے جذبات سے متعلق ہے۔ جیسے اُن کی تمام تر شاعری ہے۔ حفیظ اپنی رقاصہ میں ایک رقاصہ کو "ہٹ سامنے سے دُور ہو" "مردود ہو مقہور ہو" اور "اے بے حیا تو کون ہے" کہہ دینے کے بعد پھر کہنے لگتے ہیں۔ "ہاں ناچتی جا گائے جا" "نظروں سے دل برمائے جا" اس خیال کے تضاد نے اُن کی نظم میں یگانگتِ خیال نہیں رہنے دی۔ اگرچہ اس کے ترنم کی وجہ سے اس میں نسبتاً زیادہ اثر ہے۔ یہ خیال کا وہی تضاد ہے جس کا جواز پروفیسر تاثیر صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ "یہ نظم ایسے آدمی کے تشخص میں لکھی گئی ہے جو پہلے تو گناہ کے خلاف اپنی آواز اُٹھاتا ہے مگر اس بلند آہنگی کا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر ہمیشہ کے لئے اپنے حال میں مست ہو جاتا ہے۔"

اختر کی نظم "ایک حُسن فروش سے" چونکہ کسی معاشرتی نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی اس لئے اُس میں شاعر کے اصلی جذبات موجود ہیں۔ جو ممکن ہے ایک حد تک عریاں بھی تصوّر کر لئے جائیں اور نہ اس کا انداز اس حد تک اخلاقی ہے جس حد تک اُن کی نظموں "انجامِ ہستی" اور "شہروں کی ویرانی" کا ہے۔ اس کے علاوہ "حُسن فروش کے متعلق" شاعر کے جذبات کا توازن اور خیال کی یگانگت قائم رہتی ہے جس طنز آمیز زہریلی نفرت کا اظہار شروع میں ہے ویسا ہی آخیر تک چلا جاتا ہے ؎

ایک حُسن فروش سے

محبت! آہ تیری یہ محبت رات بھر کی ہے — تری رنگین خلوت کی لطافت رات بھر کی ہے

ترے شاداب ہونٹوں کی عنایت رات بھر کی ہے — ترے مستانہ بوسوں کی حلاوت رات بھر کی ہے

مہ روشن ہے تُو اور تیری طلعت رات بھر کی ہے
گُل شب بُو ہے تُو اور تیری نکہت رات بھر کی ہے

تُو کیا جانے کہ سودائے محبت کس کو کہتے ہیں؟ محبت اور محبت کی لطافت کس کو کہتے ہیں؟
غمِ ہجراں ہے کیا اور سوزِ الفت کس کو کہتے ہیں؟ جنوں ہوتا ہے کیسا اور وحشت کس کو کہتے ہیں؟
تُو کیا جانے غمِ شہلائے فرقت کس کو کہتے ہیں؟
ترے اظہارِ الفت کی فصاحت رات بھر کی ہے

نگاہِ مست سے دل کو مرے بہکا رہی ہے تُو اداے شوخ سے جذبات کو بھڑکا رہی ہے تُو
مجھے بچے کی صورت ناز سے بہلا رہی ہے تُو کھلونے دے کے بوسوں کے مجھے بہلا رہی ہے تُو
مگر نادان ہے تُو آہ دھوکا کھا رہی ہے تُو
مجھے معلوم ہے تیری محبت رات بھر کی ہے

ترے زہریلے بوسے مجھ کو جس دم یاد آئیں گے مرے ہونٹوں پہ کالے ناگ بن کر تھرتھرائینگے
پشیمانی کے جذبے مجھ کو دیوانہ بنائیں گے مرے افکار کو نفرت کے خنجر گدگدائیں گے
مرے دل کی رگوں میں غم کے شعلے تیر جائیں گے
میں سمجھا! آہ سمجھا یہ مسرت رات بھر کی ہے

مجھے دیوانہ کرنے کی مسرت بے خبر کب تک؟ رہے گی میرے دل میں تیری الفت کارگر کب تک؟
مجھے مسحور رکھے گا یہ عشقِ بے ثمر کب تک؟ حقیقت کی سحر آخر نہ ہوگی پردہ در کب تک؟
مجھے مغلوب کر کے خوش ہے تُو ظالم مگر کب تک؟
تری یہ فتح میری یہ ہزیمت رات بھر کی ہے!

اس نظم کے آخری بند سے اختر کی اُس رجائیت optimism پر بھی روشنی پڑتی ہے جو حفیظ کی "نغاصہ" میں بالکل مفقود ہے۔ شاعر کو اس بات کا یقین ہے کہ حقیقت کی سحر آخر طلوع

ہو کر رہے گی اور دُنیا میں انوارِ یزدانی پر چھائے ہوئے اہرمنوں کی فتح "محض ہنگامی" ہے۔

میرے ایک دوست نے اختر کی نظموں "انجام ہستی" اور "شہر دل کی ویرانی" کو دیکھ کر کہا تھا کہ "یہ ہوس و گناہ کے خلاف جنگ تو اس جوان شاعر کو بڑھانا ہی ہے"۔ یہ غلط فہمی صرف اس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب ہم اختر کی شاعری کو بھی ایک مستقل اور منظم فلسفہ کی حامل سمجھنے لگ جائیں۔ یا اختر سے بھی توقع رکھیں کہ وہ ہمیں ایک خاص "پیغام" پہنچائیں گے۔ یہ نظمیں آوارہ افکار کے چند مختلف لمحے ہیں۔ اُن افکار کے جو ممکن ہے۔ انتہائے مسرت کا ردِ عمل ہوں بعض گذرے ہوئے ایامِ عشرت کی پسماندہ تلخیاں ہوں یا "دماغی عیاشی" کی بے ثبات لذتوں کا انجام!

جوانی میں جیسا کہ ریوکرٹ نے لکھا ہے: "ہر شخص کے پیشِ نظر اُس زندگی کی تصویر ہوتی ہے جسے وہ اختیار کرنا چاہتا ہے"۔ مگر شاید کر نہیں کر سکتا۔ ہر نوجوان اپنے نفس کی مکمل صورت صرف چشمِ تصور ہی میں دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اختر کے یہ نظریے جوانی میں ایک آئندہ اخلاقی زندگی کے خواب ہوں۔

مگر ان نظموں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ضرور کامیاب ہوتے ہیں کہ گناہ کا احساس ابھی سے اختر کے دل پر ایک مستقل ہیبت بن کر طاری رہتا ہے۔ وہ گناہ سے اور اُس کے مہیب نظاروں سے اُسی طرح کانپتے ہیں جس طرح گوئٹے کا یزدان اپنے اہرمن سے لرزتا ہے۔

اختر ایک جذباتی شاعر ہیں اور اپنے جذبات ہی کے ذریعے سے وہ زندگی کی مختلف اور گونا گون منازل سے گزرتے رہتے ہیں۔ جوانی اور رومانیت، محبت، عیش و عشرت اور زہد و تقدس۔ زندگی کی بعض درشت حقیقتوں سے متاثر ہونے کی وجہ سے مؤخر الذکر احساس اُن کی شاعری میں نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل کر گیا ہے۔

اُن کی ایک نظم "نارضامندی کی شادی" ہے جو شاید اُن کی اپنی زندگی کی ایک نہایت ہی درشت حقیقت کا نتیجہ ہے اور ایک سماجی نظم ہونے کی حیثیت سے قابلِ تحسین بھی ہے لیکن

مجھے اعتراف ہے کہ شعری حیثیت سے وہ نہایت بے کیف ہو کر رہ گئی ہے لیکن اختر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرنا ہو تو اس کے بعض حصّے نقل کرنے کی ترغیب کو روک نہیں سکتا۔

یہ رشتہ وہ ہے جسے والدین کرتے ہیں ادا سمجھ کے اسے فرضِ عین کرتے ہیں
یہ کچھ ضرور نہیں جانبین راضی ہوں یہ شرط ہے کہ فقط والدین راضی ہوں
کہو اب اس زن و شوہر کا حال کیا ہوگا؟ اور ایسی شادی کا آخر مآل کیا ہوگا؟

یہ نظم حقیقتاً ایک وعظ ہے اور شاید اسی وجہ سے شعریت سے نا آشنا ہے۔ اس کا مطالعہ شاید سوسائٹی کے دو قسم کے افراد کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جو شاعری کو معاشرتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا ارادہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی شادی اُن کی نارضامندی سے کریں گے۔

اختر کی جوانی اور جوان نگاری کے ثبوت میں اُن کی شاعری سے دو اور باتیں ملتی ہیں۔ لڑنے اور جنگ کرنے کی آرزو! یہ "مجلس اقوام" کی اخلاقیات کی رو سے کتنا پست فعل کیوں نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوان آدمی کی جوانی اس کی ستیزہ کار روح ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اختر نے اپنی ایک اور سماجی نظم میں جسے وہ ایک "وطنی لوری" کہنا پسند کرتے ہیں اس جوانانہ روح کا اظہار کیا ہے۔ ماں اپنے بچے کے متعلق کہتی ہے ؎

خدا رکھے جواں ہوگا تو یہ ایسا جواں ہوگا حسین و کارداں ہوگا دلیر و تیغ راں ہوگا
بہت شیریں زباں ہوگا بہت رنگیں بیاں ہوگا یہ محبوبِ جہاں ہوگا، مرا ننھا جواں ہوگا
مرا ننھا بہادر ایک دن تلوار اٹھائے گا سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہِ رزم جائیگا
وطن کے دشمنوں کے خون کی نہریں بہائے گا اور آخر کامراں ہوگا، مرا ننھا جواں ہوگا

اردو میں لوریاں لکھنے کی رسم بہت کم ہے۔ اختر کی لوری نہ صرف اس وجہ سے قابلِ تحسین ہے بلکہ اپنی ولولہ انگیز قوت کی وجہ سے لاثانی بھی ہے۔ کیا اس نظم کو پڑھتے ہوئے ہمارا تصوّر

ہمیں چغتائی کی تصویر "اسرار حیات" کی طرف نہیں لے جاتا؟ وہاں بھی ایک بچہ ہے جو ماں کی ایسی ہی امیدوں کا مرکز ہے۔

ایک فارسی نظم میں لکھتے ہیں ؎

من شیر نوجوانم و میدانم آرزوست　　　افغانم و شجاعت افغانم آرزوست

با ساقی و مغنی و دلبر مرا چہ کار　　　تیغ و تفنگ و خنجر برانم آرزوست

آزادی وطن کہ بہ ایماں برابر است　　　ایمان من ہمیں فقط ایمانم آرزوست

اختر بگیر تیغ و دلیرانہ باز گو

من شیر نوجوانم و میدانم آرزوست

اس نظم کی روانی پر نہ جایئے۔ اس میں ایک نوجوان افغان، ایک جذبات پرور افغان کی روح کا اضطراب دیکھئے۔ یہ نظم اور اس قسم کی چند اور فارسی نظمیں، مجھے جہاں تک معلوم ہے گزشتہ انقلاب افغانستان کے زمانے میں لکھی گئی تھیں اور اسی لئے آزادی وطن سے مراد آزادی افغانستان ہے۔ ان کا ایک مصرعہ ہے۔ ع

اہرمنیان سفلہ ز دستم کجا روند؟

ایک اور فارسی نظم میں لکھتے ہیں ؎

شیران جنگ پیشہ بمکتب نمی روند　　　اختر بیار توسن و تیغ و سناں کجاست؟

ان نظموں کے ہوتے ہوئے اختر محض ایک عشق باز شاعر نہیں رہ جاتے۔ اگرچہ عشق کو ان کی نظموں میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی بچپن کے زمانے میں انہوں نے ایک شعر لکھا تھا ؎

اسیر پنجۂ اہرمن ست ملک خدا　　　کجاست تیغ کہ با خاک و خوں بپردازم

اختر کی یہ دوگونہ ذہنیت انہیں انگلستان قدیم کے ایک "نائٹ" کی شکل میں پیش کرتی ہے جو بیک وقت لڑتا تھا اور عشق کرتا تھا۔ اور جس کے لئے یہ دونوں چیزیں یکساں اہمیت رکھتی

غرض اگر ہم اختر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اُن کے اس نوع کے جذبات کو کسی طرح صرف نظر نہیں کر سکتے تاہم اُن کے اس وطنی جذبے کو اُن کی شاعری میں وہی حیثیت حاصل ہے جو مثلاً آسکر وائلڈ کے ہاں مذہبی وجدان کو حاصل تھی۔

کیٹس اس سرد فلسفے سے بہت بھاگتا ہے جس کے متعلق اُس نے کہا تھا کہ اس کے ایک لمس سے تمام طلسم ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہر بڑا نقاش جذبات کے تجزیے سے کتراتا ہے۔ اختر صرف جذبات کے نقاش ہیں۔ جذبات پرست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آوارہ تخیل شاعر ضرور ہیں اور بعض دفعہ نادانستہ خیالات کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ لیکن کولرج، رومی یا ٹیگور کی طرح اُنہوں نے کبھی معرفت اور تصوف کا لبادہ پہن کر کہانیوں اور تمثیلوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اور کبھی افیم کی ایک چسکی لے کر ہاتھ میں قلم اُٹھائے صفحہ قرطاس پر افسانے لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس نام نہاد روحانیت اور تصوف سے بہت گھبراتے ہیں جو ہماری روح میں ایک گہرا جمود پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے مادی اور ارضی احساسات کے گرد ان موہوم تاروں کو حلقہ زن نہیں ہونے دیتے۔ دُنیا اُن کے خیال میں ہمیشہ ایک مادی حقیقت ہی رہی ہے۔

اس سے پیشتر اُن کی دُنیائے مسرت کے تعمیری عناصر کا ذکر کر چکا ہوں اُس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے کہ اختر ورڈزورتھ یا مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی طرح اُس فطرت کے دلدادہ ہیں جو عبارت ہے درختوں سے، پرندوں سے، پہاڑوں اور دریاؤں سے۔ اختر کی شاعری میں اگر احساسِ فطرت کو کچھ دخل ہے تو وہ داخلیت یا شخصی محسوسات کے رنگ میں ڈوبی ہوئی فطرت ہے عشق کے علاوہ جو مظاہرات بھی اُن کی شاعری کا موضوع بنے ہیں وہ اُن کی طبعی شعریت اور رومان پسندی میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اس کہنے سے میرا مقصد یہ بھی ہے کہ اختر لازمی طور پر جوش وغیرہ کی طرح مناظر کے پرستار شاعر نہیں ہیں۔

اختر کی شاعری کی روح تغزل ہے اپنے اصلی معنوں میں! انہوں نے اس روح تغزل و غنائیت

کو اپنی تمام شاعری پر پھیلا رکھا ہے نغمے اُن کے سینے کی گہرائیوں سے ایک ولولہ انگیز ترنم لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اُن کی نظم "کلیاں" میں ایک عجیب قسم کی لطافت ہے "اے سرزمین گجرات"[1] ایک موسیقیِ قدیم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور "اے عشق کہیں لے چل" میں ایک ایسی سکی ہے جو اقبال کی "ایک آرزو" میں نہیں۔ یہ کچھ ایسا افسوسناک امر نہیں کہ اختر مسلسل واقعاتی نظمیں نہیں لکھ سکے لیکن صورت گری میں وہ ایک ماہر نقاش اور بعض دفعہ ایک زبردست صناع کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں بعض جگہ نقاشی چھوڑ کر صنم کاری بھی کرتے ہیں۔ مگر وہاں بھی اُن کے اصنام ایسے نہیں ہوتے کہ بتکدے کی محراب میں ساکت و جامد پڑے رہیں بلکہ وہ بولنا چاہتے ہیں اور حرکت کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی نظم "گاگر بھرتے ہوئے" کی ساکت و جامد تصویر بھی انسانی جذبات سے معمور ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوگا کہ شدتِ احساس ہی نے اس کو ساکت و جامد کر دیا ہے۔

اختر کی تصویریں بعض اوقات بنجمن ہیڈن کی تصویروں کی طرح حجم میں بڑی ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ تھوڑے حجم کی تصویر بنانا جس میں اتنی ایمائی قوت ہو کہ اختصار کے باوجود ہمارے جذبات پر حاوی ہو جائے اُن کے لئے بہت مشکل ہے۔ مگر اُن کی تصویروں کی وجہِ تخلیق ہمیشہ ایک بے اختیار جذبہ ہوتا ہے۔ ہیڈن کی طرح محض ایک شوقِ مسابقت نہیں ہوتا۔ وہ سادہ اور بے رنگ پنسل کے انگاروں پر مطمئن نہیں رہتے بلکہ انہیں نفرت سے دیکھتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ اپنی تصویروں میں رنگ بھر بھر کر انہیں عہد بربریت کی نقاشی کے بہت قریب لے جاتے ہیں۔ انہیں جب کبھی کوئی جذبہ ظاہر کرنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی فضا اور عقبی زمین کا تعین ضرور کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے کرداروں کے لئے تجرید یا اپنی مخصوص فضا سے علیحدگی بہت حد تک ناممکن ہے۔ ان کے رنگ ہر چند بعض اوقات بہت شوخ ہو جاتے ہیں لیکن ایک حقیقی فن کاری کے رنگوں کی طرح ہمیشہ اپنی جگہ پر موزوں ہوتے ہیں میں کہہ چکا ہوں کہ بعض دفعہ اُن کی جذبات لذت کی خواہش ان کی تصویروں کو اخلاق پرست لوگوں کی نظروں میں عریاں کر دیتی ہے مگر میں اسے محض ایک "دماغی عیاشی" کہونگا۔ اُن کی نظم "جوگن" میں یہ دماغی

---

[1] یہ نظم بھی نہ مل سکی (ناشر)

عیاشی" اپنے کمال پر موجود ہے اور لطف یہ کہ یہی نظم اُن کی فن کاری کی بہترین مثال ہے ؎

اٹکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے

آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں
دوشیزگی کی گنگا طوفاں اُٹھا رہی ہے

اک گیروا سی ساری سے ہے بدن چھپائے
یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے

اک بحرِ یاسمیں پر لہرا رہی ہے ناگن
یا اُس کی زلفِ مشکیں سینہ پر آ رہی ہے

ہے اک ستار اُس کے آغوشِ نازنیں میں
نازک سی اُنگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اُن کی نظم "معصومیت" میں جس کا پہلے بھی کسی اور سلسلے میں ذکر آچکا ہے مصوری اور ڈراما دست و گریبان نظر آتی ہیں۔ اور اُن کی نظم "نورجہاں" میں تصویروں کا ایک تسلسل ہے لیکن عقبی زمین ویسے ہی ساکن اور نیند میں سرشار۔ مثلاً ؎

خدائی نیند میں سرشار ہے برکھا کا موسم ہے
زمینِ شہدرہ پہ ہر طرف کھویا سا عالم ہے

اور کچھ اشعار چھوڑ کر ؎

رسیلی رُت کی موجیں اُڑ رہی ہیں سرو و سوسن پر
بہاروں کا سماں چھایا ہوا ہے سارے گلشن پر

پرندے سو چکے ہیں جا کر اپنے آشیانوں میں
بھیانک سنسنی سی چھا رہی ہے گلستانوں میں

سو بھیلی رات پر طاری ہے اندوہِ حسیں کوئی
کہ گہری فکر میں لپٹی ہوئی ہے مہ جبیں کوئی

اس نظم کے تاریخی تصورات اُس احساس کی آگ کو بھڑکا دیتے ہیں جو زمانِ جہانگیری کی یاد سے وابستہ ہیں۔ اس نظم میں اُن کے لطیف، مدھ بھرے اور مترنم احساسات اُن کی کئی دوسری نظموں سے زیادہ اثر انگیز ہیں۔

اختر کی ایک غزل کا شعر میرے سامنے ہمیشہ ایک تصویر بن کر موجود رہتا ہے ؎

خواب نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار
نور و نکہت کی داستانِ خموش

میرے خیال میں کوئی تشریح اس شعر کی ناقابلِ اظہار خاموش مستی کو واضح نہیں کرسکتی اور شاید ہی کوئی مصور اپنے موقلم سے اس روح افزا منظر کے نقوش پیدا کر سکا ہو یا پیدا کر سکے۔

ایک نظم "حسنِ معصوم اور اس کی محافظ حور" کے آغاز میں لفظوں کے موسیقیت آمیز توازن نے ڈرامائی لطف پیدا کر دیا ہے ؎

تمام بستی کو آگ اک آتشیں ترانہ سنا رہی ہے ۔۔۔ فضائے شبگوں میں سرخ شعلوں کا تند طوفاں اٹھا رہی ہے
مکان ہو یا مکیں ہو ہر اک کو اک سرے سے جلا رہی ہے ۔۔۔ بھڑکتی، بڑھتی، مچلتی، اٹھتی، تڑپتی لہراتی آ رہی ہے

ایک اور نظم میں ادنیٰ اور معمولی الفاظ نے ایک معجز نما مرمریں تصویر تیار کر کے رکھ دی ہے۔ جو ساکت و جامد ہے ـــــ مگر جذبات سے لبریز ؎

سنہری پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے ۔۔۔ شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

"سنہری پانی" سے شفق کی تمام رنگ آمیزیاں عریاں ہوگئی ہیں "چاندی سے پاؤں لٹکائے" کے پس پشت ایک حسینہ کی تصویر ہے جو ندی کے کنارے حد سے زیادہ محویت میں کھو کر شفق کی رنگینیوں سے محظوظ ہو رہی ہے۔

اختر کے ذوقِ نغمہ کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اشارۃً ذکر آچکا ہے کہ اختر نغمہ و سرود کے مجنونانہ طور پر دلدادہ ہیں اور نغمہ کی پرستش ان کی شاعری کا "جذبۂ غالب" ہے اور ان کی شاعری میں نغموں کو وہی اہمیت حاصل ہے جو کیٹس کے یہاں پھولوں کو ہے۔ اپنی ایک نظم "دعا" میں خدا کے حضور میں بھی التجائے نغمہ کرتے ہیں ؎

سرودآبادِ ہستی میں، میں اک سازِ شکستہ ہوں ۔۔۔ مرے خاموش تاروں کو ترنم آشنا کر دے

اُن کی نظم "جوگن" کا موضوع ہی ہندوستان قدیم کی ایک "موسیقیانہ رات" ہے جوگن کی غمگین راگنی کی ہر تان مدہوش گھاٹیوں اور خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اڑا دیتی ہے۔ زمرد میں پرند پھول سو رہے ہیں وہ جاگ جاگ اٹھتے ہیں۔ ان کے لفظ "شعلے" ہیں۔ ان کے نغمے "چھریاں" ہیں۔ جب تک نغمہ جاری رہتا ہے شاعر کے ہوش و حواس میں بھی ایک بیداری اور ایک قوت سی رہتی ہے لیکن جوگن کی تانیں ختم ہوتے ہی اس پر ایک بےخودی طاری ہو جاتی ہے جس کے ماتحت وہ محسوس کرتا ہے۔

ع جیسے وہ ظالم اب تک ویسے ہی گا رہی ہے

اور ؎

اب تک افق پہ یکسر مستی سی چھا رہی ہے
اب تک فضا پہ ہے وہ کھویا ہوا سا عالم

اب تک لبان اُس کی بجلی گرا رہی ہے
اب تک اُٹھا رہا ہے ساز اس کا ابر نغمہ

پتوں سے اب تک اُس کی آواز آ رہی ہے
پھولوں سے اب تک اُس کے نغمے برس رہے ہیں

گویا جوگن کی روح ہر پھول اور پتے میں جذب ہو کر رہ گئی ہے ہمیشہ کے لئے۔ اور وہ پھول اور پتے گویا ایک ابدی بیخودی ایک جاودانی نشے میں جھوم کر ان بھولے ہوئے نغموں کو دہرانے جائینگے۔ یہی احساس ہے جس نے غالب کی زبان سے کہلوا دیا تھا ع مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

اور کیٹس کا "خواب بیداری" اختر کا "کھویا ہوا سا عالم ہے"۔ "جوگن" سے ذرا کم پایہ کی نظمیں "بانسری کی آواز"، "پریم بستی" اور "دیہاتی لڑکی کا گیت" وغیرہ کی تخلیق کا باعث یہی ہوس نغمہ ہے جو ہر وقت اُن کے دل میں موجود رہتی ہے۔ موخر الذکر نظم ہندوستان کی ایک شمالی نوجوان دیہاتی لڑکی کا گیت ہے جس کی شادی کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، سسرال میں برکھا رت آ گئی ہے۔ وہ ہندوستان کے اس روح افزا موسم میں طبیعت میں ایک عجیب قسم کی اُمنگ محسوس کرتی ہے اور ایک مقید پرندے کی طرح اپنے میکے کی یاد میں ایک سوز بھرا راگ چھیڑتی ہے۔ راگ ہندوستان کی دیہاتی معاشرت میں کچھ اس طرح ڈوبا ہوا ہے کہ غالباً وہ شخص جو اس معاشرت سے نا واقف ہو اس کی لطافت کے احساس سے محروم رہ جاتا ہے۔ ع یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

کس قدر گہرے سوز میں ڈوبا ہوا گیت ہے اماں، ابا اور بھائی کی یاد کی خلشوں سے بھرا ہوا گیت۔

اُن کی نظم "جشنِ بہار" میں ہوسِ نغمہ کے ساتھ ہوسِ رقص بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اُن کی ایک نظم "خدائے رقص" بھی ہے جس میں وہ رقاصہ کو فقیہ شہر کی خشم آگین نظروں سے ڈرتے ہوئے بھی "خدائے رقص" کہہ دیتے ہیں۔ اس نظم میں رقص کا تمام ترنم لفظوں میں منتقل ہو کر آ گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اختر رقاصہ اور حسن فروشی میں امتیاز کرتے ہیں۔ رقص آرٹ ہے اور حسن فروشی آرٹ کی

ذلّت! افسوس کہ حفیظ اپنی نظم "رقاصہ" میں اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔

نغمہ اور رقص اختر کے لئے ایک لاتناہی حظ کا سامان رکھتے ہیں۔ اپنے ایک سانیٹ میں وہ نغمے کے اصلی تاثرات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس شاداب رات کی کیفیتیں ایک عرصہ تک اُن کے دل میں موجود رہیں لیکن لفظوں میں ظاہر نہ ہو سکیں۔ اُن دنوں حد سے زیادہ مضطرب رہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ہر وقت ایک ہیجان رہتا تھا آخر یہ سانیٹ لکھا گیا اور اُن کو اپنی روح میں ایک سکون محسوس ہوا ایک اطمینان محسوس ہونے لگا ؎

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگین وادیاں گویا

شرابِ شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں — افق پر موجزن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں ہیں
فضا میں بس رہی ہیں حسن کی آبادیاں گویا — خلا میں پرفشاں ہیں نور کی شہزادیاں گویا
بہار و کیف سے لبریز مستانہ ہوائیں ہیں — اور اُن میں منتشر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں

فنا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا

وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نظارے برستے ہیں

شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں — ستاروں کے سمندر، ماہتابوں کے جزیرے ہیں

بہاریں منظروں پر پھول اور تارے برستے ہیں

فضا ہے مست موجِ نکہتِ بادِ بہاری سے — اور اُس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

اختر کے مذکورہ بالا سانیٹ کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود بھی ایک غیر مادی جسم اختیار کر کے شاعر کے ساتھ ساتھ ہوا کی سطح پر تیر رہے ہیں۔ نقاش اور شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے محسوسات ناظر یا قاری کے دل میں بھر دے۔ اختر کے لئے نغمہ زندگی کی روح ہے۔ بے اختیاری کے اس وجد انگیز احساس سے جو نغمے سے پیدا ہوتا ہے اُن کے لئے ایک جہان لذت ہے ان دنوں حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک نظم "رقص" کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ یہ نظم اختر کے سالے

"خیالستان" میں چھپی اور وہاں سے "ہمایوں" کے علاوہ کئی رسالوں نے نقل کی۔ اس میں صرف ایک شعر ایسا ہے جس میں شاعر نے رقص کے نتائج و اثرات کو قلم بند کیا ہے ؎

جوشِ حدِ عقل و دانش سے گذر جانے دے مجھے
بس بس اب خاموش ہو اور رقص کرنے دے مجھے

اختر نے ایک نوٹ میں اس شعر پر اپنے خیالات کا اظہار اس نیم مزاحیہ انداز میں کیا ہے "ہمیں اس سے صرف اتنا اختلاف ہے کہ خود رقص کرنے کی بجائے کسی دوسرے کے رقص میں کھو جانا زیادہ پسندیدہ ہے کہ محویتِ رقص کا نتیجہ لازماً رقص ہی ہونا چاہئے"۔ اس سے قطع نظر اس نظم کے حسن پر جو سب سے بڑا دھبہ ہے وہ شاعر کا اظہارِ دلائل اور جذبات کا منطقیانہ تجزیہ ہے جو سید سلطان حیدر جوش کے الفاظ میں "نقاش اور شاعر کے ناقابلِ معافی گناہ ہیں"۔ مثلاً

رقص کیا ہے؟ خاک کے دل میں خروشِ کائنات
پیکرِ فانی میں گرمِ نازِ لافانی حیات

اور:- رقص کیا ہے؟ لرزشِ مژگاں کا لحن بے خروش

اور:- رقص کیا ہے؟ معنیٔ بے لفظ کی شرحِ خموش

اور:- رقص کیا ہے؟ نرگسِ بیدار کا خوابِ گراں

یہ سوال و جواب کا سلسلہ ذوقِ سلیم پر صد درجہ گراں گزرتا ہے اور الفاظ کے بے معنی پیچ و تاب سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شاعر پر حقیقتاً رقص نے کوئی بیخودی طاری نہیں کی۔ اس کے خلاف اختر کی نظم "نغمے کے تاثرات" میں شاعر کے شخصی احساسات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حالانکہ نغمے کا لفظ اس نظم میں ایک بار بھی نہیں واقع ہوا۔ حضرت جوش کی نظم کے متعلق مجھے اختر کے اس خیال سے اختلاف ہے کہ "اس میں وہ حسین و جمیل محسوسات ہیں جو ایک حساس ذوق پر نشے کی طرح چھاتے اور پھیلتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔"

ان کا یہ قول اپنی مذکورہ بالا نظم پر بہتر طور پر عائد ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشید آغاز

"باز بر آنم کہ نیاز آورم
رُخ بہ تماشا گہِ ناز آورم"

پھر قلم بیتاب ہے موتی لٹانے کے لئے
کہکشاں جھکنے لگی دامن بڑھانے کے لئے

پھر صلائے عام دی پیرِ مغان عشق نے
بادہ نوشانِ تخیّل کو جگانے کے لئے

زہرہ پھر بربط بکف ہو کر ہوا میں آ گئی
کارگاہِ خاک پر نغمے لٹانے کے لئے

شمع دل کرتا ہوں روشن رہ گزارِ عشق پر
سوز و سازِ غم کی ہمت آزمانے کے لئے

شوق نے بخشا ہی پھر نے رنگیوں کو آب و رنگ
قطرہ ہے آمادہ پھر دریا بہانے کے لئے

دل میں ذوقِ آرزو پھر چٹکیاں لینے لگا
حُسن کی نازک دلی کو گدگدانے کے لیئے

پھر جبیں میں بال زن ہے موجِ بیتابیٔ عشق
آستانِ حُسن پہ سجدے لٹانے کے لیئے

گرچہ دُنیائے صحافت سے طبیعت سیر تھی
دل تھا مضطر، اک نئی دُنیا بسانے کے لئے

جس میں افکارِ زمانہ ہوں نہ افکارِ حیات
طبعِ رنگیں کی لطافت کو لٹانے کے لئے

جس میں بد ذوقی کے صدمے ہوں نہ کج فہمی کا خوف
روح و دل کی خلوتوں میں بار پانے کے لئے

لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں!
چاہیے ہنگامہ جنوں کا دل لبھانے کے لئے

یہ وہ بازارِ زیاں دیر ہے جس کو ہمنشیں!
جنسِ کاسد چاہیے رونق بڑھانے کے لئے

رنگِ دورِ روزگارِ سفلہ پرور دیکھئے
شاعری ہے اک بہانہ مانگ کھانے کے لئے

آہ وہ احساسِ شیریں نام ہی جس کا ادب
اک تجارت رہ گیا ہے اب زمانے کے لئے

وہ گدازِ روح، دُنیا شعر کہتی تھی جسے
لحن سائل بن گیا دولت کمانے کے لئے

جذبۂ دل اک کھلونا بن چلا بازار کا
سادہ لوحوں کی مسرت کو بڑھانے کے لئے

آہ وہ حکمت کہ تھی گنجِ ہزار انسانیت
دستِ مسکیں بن گئی جیبیں ٹٹانے کے لئے

خوابِ طفلاں کے جمالِ بے نیازی کی قسم — یہ چمن موزوں نہ تھا میرے ترانے کے لئے

میں کہاں اخذِ متاعِ عالمِ فانی کہاں — طائرِ سدرہ نہیں تنکے اُٹھانے کے لئے

میرے ذوقِ بیخودی کو دو جہاں ہیں نیم گام — وہ بھی تھے اُن کی وسعت کا بڑھانے کے لئے

میں وہ میکش ہوں کہ گلزارِ جہاں سے صبح و شام — حوریں آتی ہیں مجھے کوثر پلانے کے لئے

میں وہ مجنوں ہوں کہ گر سیرِ جنوں منظور ہو — دشت میں آ جائے لیلیٰ خاک اُڑانے کے لئے

میں ہوں وہ وامق کہ ذوقِ بندگی ہو گر قبول — میرے در پہ آئے عذرا سر جھکانے کے لئے

میں وہ خسرو ہوں کہ گر چاہوں بہ جدتِ عاشقی — مضطرب شیریں ہو جوئے شیر لانے کے لئے

میں وہ یوسف ہوں کہ ہو گر جستجوئے مشتری — آئے خود حُسنِ ازل قیمت لگانے کے لئے

خاک و خاکستر نشینی گر مجھے منظور ہو — جنتیں لے آئیں پھول اپنے بچھانے کے لئے

میرے سینے میں ہیں وہ احساس کے شعلے نہاں — مہر و مہ ہیں مضطرب جن میں نہانے کے لئے

دل میں ایسے وجدان کے کعبے ہیں رقصاں اے ندیم! — جن میں آتے ہیں فرشتے سر جھکانے کے لئے

اک نگاہِ پُر تبسم قیمتِ ہر دو جہاں — وہ بھی گر نورِ ازل آئے لُبھانے کے لئے

دل کے کاشانے میں ہیں فانوس، اشکِ سرخ کے — آرزو شعلہ ہے شمعِ غم جلانے کے لئے

الغرض حسن دل کا گہوارہ ہو خود عرش بریں — وہ کھلونا بن نہیں سکتا زمانے کے لئے

اضطرابِ شوق لیکن جنّتِ تسکین ہے — موت آتی ہے جہاں سجدے لٹانے کے لئے

شعلۂ دل، بوئے گل سے ہی طرب انگیز تر — طور برساتا ہوں جنّت کو جلانے کے لئے

عشق کی دل میں خلش ہو گو جہنّم بن کے ہو — خُلد کو چاہیں گے کیا قبریں بسانے کے لئے

اک حقارت کی ادا ہے نذرِ مرگ و زندگی — آئے کوئی بے نیازی کو مٹانے کے لئے

وہم آبادِ عدم ہے، خوابِ طفلاں سے مُراد — موت اک آئینہ، حیرت کو جگانے کے لئے

شورشِ آبادِ جہاں، بازیچۂ طفلانہ ہے — زندگی، خوابِ پریشاں بھول جانے کے لئے

موت ہے اک انتظار اور انتظارِ دائمی — کس قدر معصوم دھوکا جی لبھانے کے لئے

یہ نظامِ زندگی ہے نقشِ احساسِ خودی — ذرّہ ذرّہ مضطرب ہے سر اُٹھانے کے لئے

"نوبہار آمد نوائے بلبلاں مستانہ است"

"وقتِ جام است اے عزیزاں نوبتِ پیمانہ است"

خطابۂ ارادت

ارمغان بہ پیشگاہ جانِ پاک و روح اقدس تابناک اُستادِ یگانہ و سخنگوئے فرزانہ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی اعلی اللہ مقامہٗ

ایں قصیدہ در موقع جشنِ یادگار ہزار سالہ فردوسی" دکلکتہ) بتاریخ ۲۵ نوامبر مسیحی ۱۹۳۴ء سرودہ شد

ایا شاعرِ پاکِ ایراں زمین! ترا بر تو بادا ہزار آفرین!
سخن آفرین تا سخن آفرید سخنگوے چوں تو نیامد پدید

سرود نوا فسانہ باستاں ! نہ پاکانِ ایران و از راستاں
چہ نقش انگیختہ خامہ ات کہ ارژنگ معنی است شہنامہ ات
ز ظلمت باندیشہ ہمت رسید ز فکرِ تو نیرو بہ فکرہ رسید!
ازاں تخمِ دانش کہ برکاشتی! سخن را علم برتر افراشتی!
"زخود گفتہ ای من دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی"

"بناہائے آباد گردد خراب
زباران و از تابشِ آفتاب"
"بنا کردم از نظم کاخے بلند
کہ از باد و باراں نیابد گزند"
"ز خرشید و از آب و ز باد و خاک
نہ گردد تبہ نام و گفتارِ پاک"

بیکے چیز بنگر که ملکِ عجم	شد آراسته باز چوں عصرِ جم
زمانه پذیرفت رسمِ نوی	بدورِ شهِ فرّخِ پهلوی
رضا شاه، آں شاهِ پاکیزه دیں	که نازد بر او تخت و تاج و نگیں
زگفتارِ خوبت بآوائے رود!	برآورد ازاں خسروانی سرود!

"جهاندارِ محمودِ شاهِ بزرگ
بآبشخور آرد همے میش و گرگ
چو کودک لب از شیرِ مادر بشست
بگهوارہ محمود گوید نخست"

همان شیرِ ایراں که در خواب بود	پس از سالها چشمِ غفلت کشود
دگر زنده شد روحِ ایرانیاں	فره مندئ عهدِ ساسانیاں
پس از دورهٔ سالهائے دراز	عروسِ عجم شد بهارین طراز
طرب گاهِ خسرو گراں تا کراں	شد آباد چوں باغِ نوشیرواں

بہارِ نویں را سرودے بگو!

خزانِ کہن را درودے بگو

سخن پرورا مدح خوانِ تو ایم! تو ئی شاہ و ما بندگانِ تو ایم!

نہ ایراں فقط والۂ نامِ تو! صنم خانۂ ہند ہم رامِ تو

حقوقِ ارادت ادا کردہ ایم بگلگشتہ جشنے بپا کردہ ایم

نوائے میہمانِ حریمِ ارم! ز ما سجدۂ شوق بپذیر ہم

بیا و نو دل می چکاند سجود!

بخاکِ تو از ما ہزاراں درود

او دیس سے آنے والے بتا!

ایک نو وارد ہموطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب!

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
آوارۂ غربت کو بھی سُنا — کس رنگ میں ہیں کنعانِ وطن؟
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا؟

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں؟
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے، کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی شفق کے سایوں میں — دن رات کے دامن ملتے ہیں؟
کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی — خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں؟
برساتی ہوا کی لہروں سے — بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

شاداب و شگفتہ پھولوں سے — معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
بازار میں مالن لاتی ہے — پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں — نوعمر خریدار اب کہ نہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام پڑے گلیوں میں وہی — دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے؟
اور سڑکوں کی دھندلی شمعوں پر — سایوں کا بسیرا ہوتا ہے؟
باغوں کی گھنیری شاخوں میں — جس طرح سویرا ہوتا ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں ویسی ہی جواں — اور مدھ بھری راتیں ہوتی ہیں؟
کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی — اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں؟
وہ حسن کے جادو چلتے ہیں — وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

ویرانیوں کے آغوش میں ہے آباد وہ بازار اب کہ نہیں ؟
تلواریں بغل میں دابے ہوئے پھرتے ہیں طرحدار اب کہ نہیں؟
اور بہلیوں میں سے جھانکتے ہیں ترکانِ سیہ کار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی مہکتے مندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا اب بھی مقدس مسجد پر مستانہ اذاں تھرّاتی ہے؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟

انگڑائی کا نقشہ بن بن کر سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں؟

اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

برسات کے موسم اب بھی وہاں ویسے ہی سُہانے ہوتے ہیں؟

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں جھولے اور گانے ہوتے ہیں؟

اور دُور کہیں کچھ دیکھتے ہی نو عمر دوانے ہوتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی پہاڑی چوٹیوں پر — برسات کے بادل چھاتے ہیں؟
کیا اب بھی ہوائے ساحل کے — وہ رس بھرے جھونکے آتے ہیں؟
اور سب سے اونچی ٹیکری پر — لوگ اب بھی ترانے گاتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!
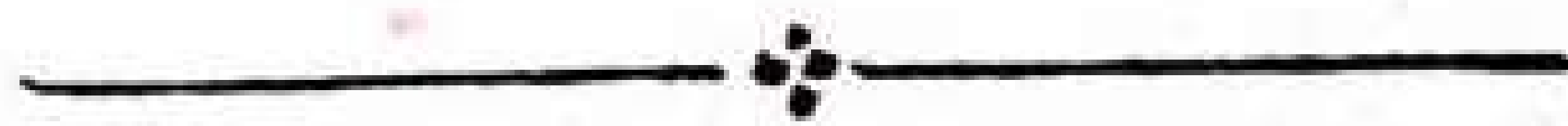
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں — گھنگھور گھٹائیں گونجتی ہیں؟
ساحل کے گھنیرے پیڑوں میں — برکھا کی ہوائیں گونجتی ہیں؟
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں — موروں کی صدائیں گونجتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!
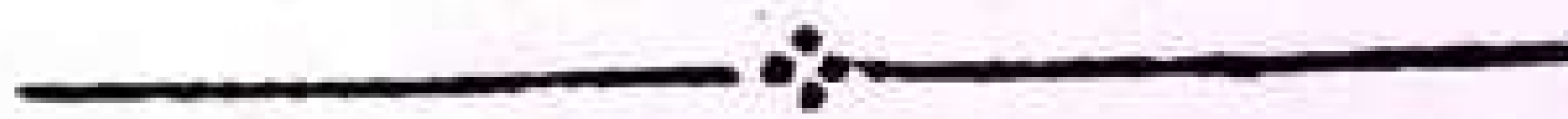
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں، میلوں میں   وُہی برسات کا جوبن ہوتا ہے؟
پھیلے ہُوئے بڑ کی شاخوں میں   جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے؟
اُمڈے ہُوئے بادل ہوتے ہیں   چھایا ہُوا ساون ہوتا ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شہر کے گرد اب بھی ہے رواں   دریائے حَسیں لہرائے ہُوئے؟
جُوں گود میں اپنے من کو لیئے   ناگن ہو کوئی تھرّائے ہُوئے
یا نُور کی ہنسلی، حُور کی گردن میں   ہو عیاں بل کھائے ہُوئے

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی فضا کے دامن میں برکھا کے سمے لہراتے ہیں؟

کیا اب بھی کنارِ دریا پر طوفان کے جھونکے آتے ہیں؟

کیا اب بھی اندھیری راتوں میں ملّاح ترانے گاتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!
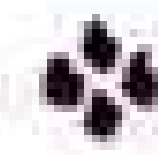
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں برسات کے دن باغوں میں بہاریں آتی ہیں؟

معصوم و حسیں دوشیزائیں برکھا کے ترانے گاتی ہیں؟

اور تیتریوں کی طرح سے رنگیں جھولوں پر لہراتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی اُفق کے سینے پر — شاداب گھٹائیں جھومتی ہیں؟
دریا کے کنارے باغوں میں — مستانہ ہوائیں جھومتی ہیں؟
اور اُن کے نشیلے جھونکوں سے — خاموش فضائیں جھومتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں — احباب، کنارِ دریا پر؟
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں — شاداب، کنارِ دریا پر؟
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے — مہتاب، کنارِ دریا پر؟

او دیس سے آنے والے بتا!
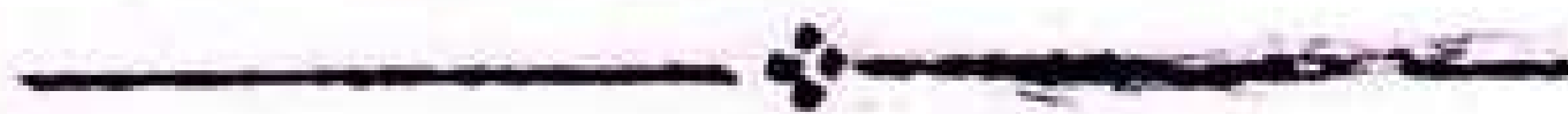
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا آم کے اونچے پیڑوں پر اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟
شاخوں کے حریری پردوں میں نغموں کے خزانے کھولتے ہیں؟
ساون کے رسیلے گیتوں سے تالاب میں امرس گھولتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی وہ مدرسے کی شاداب فضا؟
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں جس میں وہ مثالِ خواب فضا؟
وہ کھیل، وہ ہمسن، وہ میداں وہ خوابگہِ مہتاب فضا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی کسی کے سینے میں ——— باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب ——— یاروں میں کوئی آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا ——— للّٰہ بتا، للّٰہ بتا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی ——— مستانہ فضائیں بھول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں ——— ساون کی گھٹائیں بھول گئیں؟
دریا کے کنارے بھول گئے ——— جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی
مستی بھری راتیں آتی ہیں؟
دیہات کی کمسن ماہوشیں
تالاب کی جانب جاتی ہیں؟
اور چاند کی سادہ روشنی میں
رنگین ترانے گاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی گجر دم چرواہے
ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں؟
اور شام کے دھندلے سایوں کے
ہمراہ گھروں کو آتے ہیں؟
اور اپنی رسیلی بانسریوں میں
عشق کے نغمے گاتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون ہیں
برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟

معصوم گھروں سے بھور بھئے
چکّی کی صدائیں آتی ہیں؟

اور یاد میں اپنے میکے کی
بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!
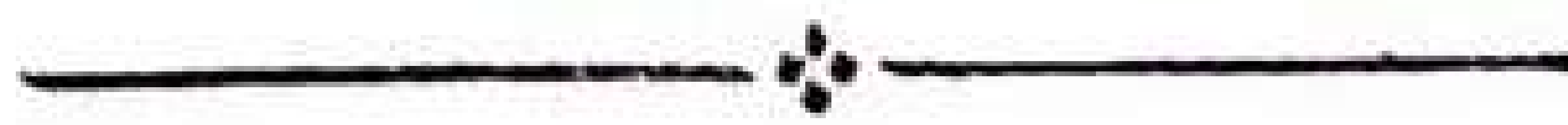
او دیس سے آنے والے بتا!

دریا کا وہ خواب آلودہ سا گھاٹ
اور اس کی فضائیں کیسی ہیں؟

وہ گاؤں وہ منظر، وہ تالاب
اور اس کی ہوائیں کیسی ہیں؟

وہ کھیت، وہ جنگل، وہ چڑیاں
اور اُن کی صدائیں کیسی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر — تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
ان پورنا کے اجڑے مندر پر — مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سنسان گھروں پر چھاؤنی کے — ویرانی و رقت طاری ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!
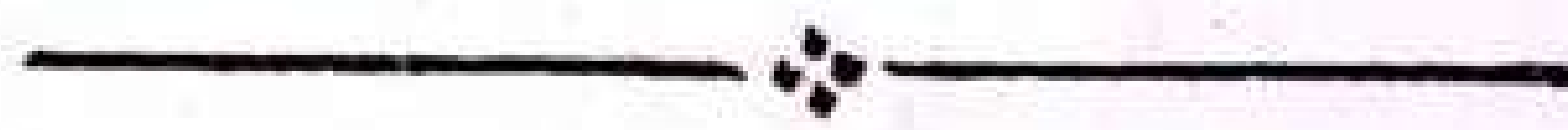
او دیس سے آنے والے بتا!

آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا — وہ غارت ایماں کیسی ہے؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی — وہ آفت دوراں کیسی ہے؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے — وہ شمع شبستاں کیسی ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بنا!

مرجانہ تھا جس کا نام بنا — وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے؟
جس پر تھے فدا طفلانِ وطن — وہ جانِ وطن کس حال میں ہے؟
وہ سروِ چمن، وہ رشکِ سمن — وہ سیم بدن کس حال میں ہے؟

او دیس سے آنے والے بنا!

او دیس سے آنے والے بنا!

کیا اب بھی رُخِ گلرنگ پہ — وہ جنّت کے نظارے روشن ہیں؟
کیا اب بھی رسیلی آنکھوں میں — ساون کے ستارے روشن ہیں؟
اور اُس کے گلابی ہونٹوں پر — بجلی کے شرارے روشن ہیں؟

او دیس سے آنے والے بنا!
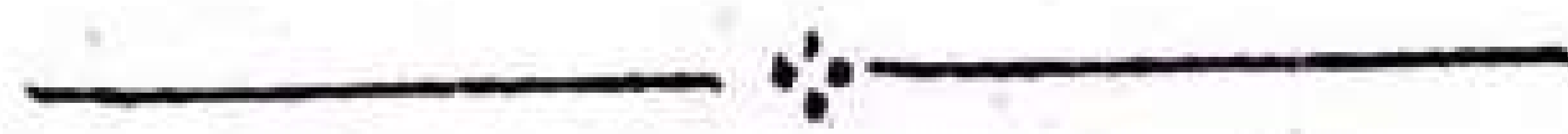
او دیس سے آنے والے بنا!

کیا اب بھی شہابی عارض پر گیسوئے سیہ بل کھاتے ہیں؟
یا بحرِ شفق کی موجوں پر دو ناگ پڑے لہراتے ہیں؟
اور جن کی جھلک سے ساون کی راتوں کے سے سپنے آتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بنا!

او دیس سے آنے والے بتا!

اب نامِ خدا، ہوگی وہ جواں میکے میں ہے یا سسرال گئی؟
دوشیزہ ہے یا آفت میں اُسے کم بخت جوانی ڈال گئی؟
گھر پر ہی رہی، یا گھر سے گئی خوشحال رہی، خوشحال گئی؟

او دیس سے آنے والے بتا!

گذری ہُوئی راتیں

نہ بھولے گا تمہارا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

رُخِ روشن کے جلووں سے سحر کا نور بن بن کر
اندھیری رات کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آنا

وہ پہلی چاندنی میں اپنی مستانہ خرامی سے
بہارِ خواب کے سائے سے برساتے ہوئے آنا

محبّت کے فرشتے کی طرح خاموش راتوں میں
فضا کو نکہتِ گیسو سے مہکاتے ہوئے آنا

ترے پازیب کی جھنکار کا آہستہ آہستہ
وہ دھیمی دھیمی لَے میں گیت برساتے ہوئے آنا

ترے ابریشمی ملبوس کا صرصر کے جھونکوں سے
سحابِ رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا

بدن اپنا چُرا لینا، کبھی نظریں جُھکا لینا
ہم آغوشی کے اندیشے سے گھبراتے ہوئے آنا

شبِ تاریک کے خاموش نظاروں کی بستی کو
شرابِ نور کی موجوں سے نہلاتے ہوئے آنا

نگاہوں میں حیا، آنکھوں میں مستی، چال میں لغزش
مصوّر کے قلم کے خواب برساتے ہوئے آنا

ہواؤں کا مہک اُٹھنا، فضاؤں کا بہک اُٹھنا
وہ مہکاتے ہوئے آنا، وہ بہکاتے ہوئے آنا

محل کے پاسباں خوابیدہ، شمعیں خواب دیدہ
اور اے ملکہ ترے سائے کا شرماتے ہوئے آنا

جہاں ریحانہ رہتی تھی!
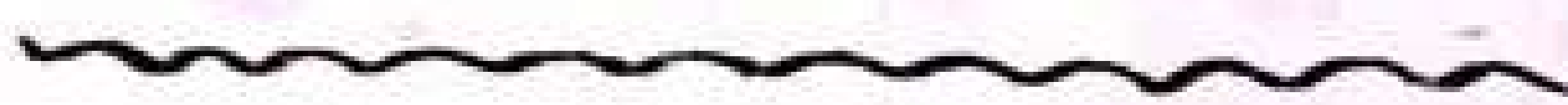
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی
کنول کا پھول تھی، سنسار سے بیگانہ رہتی تھی
نظر سے دور، مثلِ نکہتِ مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

انہی صحراؤں میں وہ اپنے گلّے کو چَراتی تھی
انہی چشموں پہ وہ ہر روز، منہ دھونے کو آتی تھی
انہی ٹیلوں کے دامن میں وہ آزادانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

کھجوروں کے تلے، وہ جو کھنڈر سے جھلملاتے ہیں
یہ سب ریحانہ کے معصوم افسانے سُناتے ہیں
وہ ان کھنڈروں میں اک دن، صورتِ افسانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

مرے ہمدم، یہ نخلستان، اک دن، اُس کا مسکن تھا
اسی کے خرمئی آغوش میں اُس کا نشیمن تھا
اسی شاداب وادی میں وہ بے باکانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہ پھولوں کی حسین آبادیاں، کاشانہ تھیں اُس کا
وہ اک بُت تھی یہ ساری وادیاں بُتخانہ تھیں اُس کا
وہ اس فردوسِ وجد و رقص میں مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

تباہی کی ہوا اس خاکِ رنگیں تک نہ آئی تھی
یہ وہ خطّہ تھا، جس میں نوبہاروں کی خدائی تھی
وہ اس خطّے میں مثلِ سبزۂ بیگانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

اسی ویرانے میں اک دن بہشتیں لہلہاتی تھیں
گھٹائیں گِھر کے آتی تھیں، ہوائیں مسکراتی تھیں
کہ وہ بن کر بہارِ جنّتِ ویرانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہ ویرانہ، گزر، جس میں نہیں ہے کارروانوں کا
جہاں ملتا نہیں نام و نشاں تک ساربانوں کا
اسی ویرانے میں اک دن، مری ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں آباد تھی اک دن، مرے افکار کی ملکہ
مرے جذبات کی دیوی، مرے اشعار کی ملکہ
وہ ملکہ، جو بزرنگِ عظمتِ شاہانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

صبا، شاخوں میں نخلستاں کی جس دم سرسراتی ہے
مجھے ہر لہر سے ریحانہ کی آواز آتی ہے
یہیں ریحانہ رہتی ہے، یہیں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

فضائیں گونجتی ہیں اب بھی اُن وحشی ترانوں سے
سُنو، آواز سی آتی ہے اُن خاکی چٹانوں سے
کہ جن میں وہ برنگِ نغمۂ بیگانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

مرے ہمدم، جنونِ شوق کا اظہار کرنے دے
مجھے اس دشت کی اک اک کلی سے پیار کرنے دے
جہاں اک دن، وہ مثلِ غنچۂ مستانہ رہتی تھی!

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

بربِّ کعبہ، اُس کی یاد میں عمریں گنوا دوں گا!
میں اس وادی کے ذرے ذرے پر سجدے بچھا دونگا
جہاں وہ جانِ کعبہ، عظمتِ بُت خانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ اس ٹیلے پر اکثر عاشقانہ گیت گاتی تھی!
پرانے سورماؤں کے فسانے گنگناتی تھی؛
یہیں پر، منتظر میری وہ بے تابانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

کھجوروں کے حسیں سائے زمیں پر لہلہاتے تھے
ستارے جگمگاتے تھے، شگوفے کھل کھلاتے تھے
فضا میں منتشر اک نکہتِ مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں بستی تھی اے ہمدم، مرے رومان کی بستی
مرے افسانوں کی دنیا، مرے وجدان کی بستی
یہیں ریحانہ بستی تھی، یہیں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

شمیمِ زلف سے اُس کی مہک جاتی تھی گُل وادی
نگاہِ مست سے اُس کی، بہک جاتی تھی گُل وادی
ہوائیں پُر فشاں، روحِ مے و میخانہ رہتی تھی!

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ گیسوئے پریشاں، یا گھٹائیں رقص کرتی تھیں
فضائیں وجد کرتی تھیں، ہوائیں رقص کرتی تھیں
وہ اس فردوس وجد و رقص میں مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

گدازِ عشق سے لبریز تھا، قلبِ حزیں اس کا
مگر آئینہ دارِ شرم تھا، روئے حسیں اُس کا
خموشی میں چھپائے نغمۂ مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

اُسے پھُولوں نے میری یاد میں بیتاب دیکھا ہے

ستاروں کی نظر نے، رات بھر بیخواب دیکھا ہے

وہ شمعِ حُسن تھی، پر صورتِ پروانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں ہمرنگِ گلہائے حسیں، رہتی تھی ریحانہ

مثالِ حُورِ فردوسِ بریں، رہتی تھی ریحانہ

یہیں رہتی تھی ریحانہ، یہیں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

پیامِ دردِ دل، اخترؔ دیئے جاتا ہوں وادی کو

سلامِ رخصتِ غمگیں، کئے جاتا ہوں وادی کو

سلام، اے وادیٔ ویراں جہاں ریحانہ رہتی تھی

ایک حادثہ

چند لمحے عذرا کے ساتھ

کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی
مرے گھر پہ شامِ بہار آ گئی

تصوّر کی نیرنگیاں کیا کہوں
جدھر دیکھئے پھول برسا گئی

مہکتا ہے اب تک شبستاں مرا
فضا میں بہاریں سی پھیلا گئی

نگاہوں میں موتی بکھرنے لگے
خیالوں میں تاروں سے برسا گئی

تخیّل میں بجلی نے انگڑائی لی
تصوّر میں ناہید لہرا گئی

فضاؤں کو جلووں سے روشن کیا
ہواؤں کو خوشبو سے مہکا گئی

سیہ پیرہن پر ستاروں کا رنگ　　کہ تاروں بھری رات شرما گئی

تصور میں اب تک مچلتے ہیں طور　　یہ کس کی تجلّی نظر آ گئی؟

ہوا، بوئے رنگیں سے بیخود ہوئی　　گھٹا، زلفِ مشکیں سے شرما گئی

اداؤں سے فتنے برستے رہے　　نگاہوں سے میخانے چھلکا گئی

بڑھی، جیسے صبحِ بنارس بڑھے　　اُٹھی، جیسے شامِ اودھ چھا گئی

وہ آنکھیں کہ رقصاں شبِ میکدہ　　وہ نظریں کہ بجلی سی لہرا گئی

شبستاں میں آئی کچھ اس ناز سے　　کہ جیسے چمن میں بہار آ گئی

وہ ابریشمیں بال، کرنوں کے ہار　　وہ چوٹی کہ ناگن سی بل کھا گئی

بدن، جیسے کلیوں کا معصوم خواب　　کمر یا کوئی شاخ لہرا گئی

گھٹاؤں نے دیکھیں نہ وہ بجلیاں　　جو نیچی نگاہوں سے دکھلا گئی

وہ پیغمبرین تکلّم، وہ رنگیں صدا　　بہشتوں کی موسیقی شرما گئی

سنائی غزل اُس نے اس ناز سے　　کہ خود شعر کی دیوی لہرا گئی

سماعت کو بلبل کا دھوکا ہُوا	کہ ناہید بربط بکف آگئی

اُٹھیں آنکھیں، بادل سے لہرا گئے	ملیں نظریں، بجلی سی تھرّا گئی

محبّت، جسے بھول بیٹھا تھا مَیں	اُسے دیکھ کر پھر سے یاد آگئی

تمنّا کی بے تابیاں بخش کر	جوانی کی راتوں کو تڑپا گئی

محبّت، خوشی، زندگی، سب کے راز	مجھے آنکھوں آنکھوں میں سمجھا گئی

نہ سمجھا خضر زندگی کا جو بھید	وہ باتوں ہی باتوں میں بتلا گئی!

مہک بن کے دم بھر کو ٹھہری مگر	مری زندگی بھر کو مہکا گئی

مری حسرتِ بوسہ کو ناز سے	"بری بات ہے" کہہ کے بہلا گئی

یہ افسانہ ہے مختصر اس طرح
کہ اختر کے پہلو سے عذرا گئی!

جمالِ سلمیٰ

مری کی صنوبرستانی راتوں میں!

مری کی ہر سبز پوش وادی ہواؤں سے تھرتھرا رہی ہے
صنوبرستاں کے دامنوں میں نسیم بربط بجا رہی ہے
شمیمِ گُل موجِ بیخودی بن کے روح کو گدگدا رہی ہے
مگر مرے دل کی دھڑکنوں سے صدا یہ رہ رہ کے آرہی ہے

"احن شوقاً" الیٰ دیارٍ لقیت فیہا جمالِ سلمیٰ
کہ می رساند ازاں نواحی نویدِ وصلے بجانبِ ما"

بہار کی چاندنی فضا میں روپہلی کرنیں لُٹا رہی ہے
جو غنچہ ہے مسکرا رہا ہے، جو شاخ ہے لہلہا رہی ہے
ہوائے کشمیر منظروں میں شگفتگی سی بسا رہی ہے
مگر مری روح دکھ بھری لَے میں اس طرح گنگنا رہی ہے

"احسن شوقاً" الے دیار لقیت فیہا جمالِ سلمیٰ
کہ می رساندازاں نواحی نویدِ وصلے بجانبِ ما"

اُن سے

دلِ غم دیدہ کو غم سہنے کی عادت نہ رہی
چشمِ مخزوں میں لہو پینے کی ہمت نہ رہی

مرنے کے دن نہیں اور جینے کی حسرت نہ رہی
رحم کر رحم کہ اب ضبط کی طاقت نہ رہی

دردِ دل بڑھ کے نہ محتاجِ مداوا ہو جائے

تیرے قربان ترا عشق نہ رسوا ہو جائے

کیا غضب ہے کہ غمِ ہجر سُنا بھی نہ سکیں
سینے کا زخم دکھائیں تو دکھا بھی نہ سکیں

صبر ہو بھی نہ سکے، رنج اٹھا بھی نہ سکیں
آپ جا بھی نہ سکیں، تم کو بلا بھی نہ سکیں

غمِ دل کون سُنے تیری بلا بھی نہ سُنے
اور نصیبوں کو یہ ضد ہے کہ خُدا بھی نہ سُنے

عشق نے ظلم وہ ڈھائے ہیں کہ جی جانتا ہے، یاس نے گل وہ کھلائے ہیں کہ جی جانتا ہے
درد، دُکھ، دل نے وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے، ہم نے وہ رنج اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اشک پردردہ ہیں، غم دیدہ ہیں مہجور ہیں ہم
او پری پاس بُلا لے کہ بہت دور ہیں ہم

جانتا ہوں کہ تمہیں بھی ہے محبّت مجھ سے گر یہ سچ ہے تو سُنو ایک شکایت مجھ سے
پہلے تو رکھتی تھیں تم خط و کتابت مجھ سے کہتی سُنتی تھیں ہم قصّۂ اُلفت مجھ سے

پھول کی طرح مہکتے ہوئے خط آتے تھے
دیکھ کر جن کو کنول روح کے کھل جاتے تھے

اب مگر مدتیں گزریں کہ وہ حالت نہ رہی وہ نوازش، وہ مروّت، وہ عنایت نہ رہی
یہ تو کس دل سے کہوں مجھ سے محبّت نہ رہی ہاں مگر اور خیالات سے فرصت نہ رہی

تم ہو اب اور مدارات ہے بیگانوں کی
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی!

خط تو لکھنے کو ہمیں لکھتی ہو اب بھی اکثر — اجنبیّت سے بھرے ہوتے ہیں لیکن یکسر
نام کو بھی نہیں ہوتا ہے محبّت کا اثر — آخر اس طرزِ تخاطب سے ہے کیا مدِّ نظر

کیا یہ مطلب ہے کہ مَیں لائقِ اُلفت نہ رہا
دل مرا درخورِ غمہائے محبّت نہ رہا

دردمندوں پہ یہ ظلم او ستم ایجاد نہ کر — میری اُمیدوں کی فردوس کو برباد نہ کر
اس پہ راضی ہوں کہ تا حشر مجھے یاد نہ کر — بن کے انجان، مگر مائلِ فریاد نہ کر

حال یہ ہے کہ دل اب غم سے مٹا چاہتا ہے
عشق پردہ نشیں بے پردہ ہُوا چاہتا ہے

پھر نہ کہنا کہ "عبث کر دیا بدنام ہمیں — پہلے معلوم نہ تھا جور کا انجام ہمیں"
یا یہ حیلہ کہ "نہیں آپ سے کچھ کام ہمیں — آپ بھیجا نہ کریں عشق کے پیغام ہمیں"

دیکھ لینا یہ بہانے نہیں کام آئیں گے
تیرے دیوانے ترے عشق میں مر جائیں گے

میرے انجام پہ پچھتاؤ گی تم، یاد رہے   اپنے اس ظلم سے شرماؤ گی تم، یاد رہے
اب اگر رحم نہ فرماؤ گی تم، یاد رہے   حشر تک پھر نہ ہمیں پاؤ گی تم یاد رہے

"رفتم از دستِ تو اے غارتِ ایماں رفتم
بہ ہوایم نہ شتابی کہ شتاباں رفتم"

نغمۂ زندگی

بربطِ کائنات پر، نغمہ سرا ہے زندگی
مست نوا ہے زندگی

وادئ مہر و ماہ تک بال کشا ہے زندگی
جلوہ نما ہے زندگی

جس کی کچھ ابتدا نہیں جس کی کچھ انتہا نہیں
جس کو کبھی فنا نہیں

خواب گہِ فنا میں نہ موجِ صدا ہے زندگی
رقصِ صبا ہے زندگی

موسمِ شعلہ بار میں، دامنِ کشت زار میں
سینۂ کاشتکار میں

بن کے لہو کا اضطراب، ہمہ نوا ہے زندگی
نغمہ سرا ہے زندگی

جام ہیں مختلف تو ہوں، اُن میں شراب ایک ہے
بادۂ ناب ایک ہے

سازِ فنا میں مشترک، ایک صدا ہے زندگی
ایک نوا ہے زندگی

رہ روِ راہِ ارتقا کے لئے اک مقام ہے
راہزنِ خرام ہے

لے کے عدم سے تا عدم ایک فضا ہے زندگی
راہ نما ہے زندگی

اُس کی ہوائے تند پر تیر رہی ہے کائنات
مستِ شرابِ حیات

طائرِ دہر کے لئے ایک فضا ہے زندگی
کیا کہوں کیا ہے زندگی

شاعر کی تربت

اک شاعرِ نوجواں کی تُربت   دامانِ خرابہ زار میں ہے
اک نکہتِ رائگاں کی تُربت   یا وادیٔ نوبہار میں ہے

شاداب و شگفتہ پھول لے کر   آتی نہیں اس طرف ہوائیں
سینے میں دلِ ملول لے کر   زائر نہیں اشک جو بہائیں

ممنون، بہار کی نہیں ہے کھلتے نہیں پھول اس زمیں سے
بیکس کا یہ مرقدِ حزیں ہے بیگانہ گلاب و یاسمیں سے

پر ، ا چشمِ بصیرت آشنا کو مل جاتے جو رخصتِ تماشا
اور غور سے گورِ باصفا کو دیکھے تو ہے عبرتِ تماشا

شاعر کے الم گسار ہیں جمع تُربت پہ ہجوم ہو رہا ہے
شمع و دلِ داغدار ہیں جمع اور جام بھی خون رو رہا ہے

وہ شمع کہ جس کی روشنی میں راتوں کو وہ فکرِ شعر کرتا
وہ جام کہ جس کو زندگی میں وہ بادۂ شعلہ گوں سے بھرتا

وہ دل کہ جو تھا اسیرِ اُلفت
اور آج بھی خوگرِ جفا ہے
پیوست ہے جس میں تیرِ اُلفت
جو پھول کی طرح جانفزا ہے

اک سمت فضا پہ چھا رہا ہے
آئینۂ رُو نمائے سلمیٰ!
یا موت کو گدگُدا رہا ہے
نظّارۂ جانفزائے سلمیٰ!

شاعر کو مگر نہیں خبر کچھ
وہ تیرہ نصیب سو رہا ہے
اُس پر نہیں حال کا اثر کچھ
جاگا تھا، غریب سو رہا ہے

سلام کے جواب میں

سلام اُس پہ کہ جس نے سلام بھیجا ہے
نگاہِ ناز کا رنگیں پیام بھیجا ہے

سلام اُس پہ کہ گر اُس کی مدح ناز کروں
ذرا سی عمر کو میں حشر تک دراز کروں

سلام اُس پہ فدا جس پہ ہر چمن کی بہار
بہشت کے گل و نسرین و نسترن کی بہار

سلام اُس پہ جسے حُورِ کہکشاں کہئے
زمیں کے شبکدے میں نورِ آسماں کہئے

وہ مہ جبیں جسے تارے بھی پیار کرتے ہیں
اور اُس کے قدموں پہ کرنیں نثار کرتے ہیں

مہ و ستارہ کا پیکر، رُخِ حسیں اُس کا
بہارِ نور کا بُت، جسمِ مرمریں اُس کا

وہ گلبدن کہ اگر سیرِ گل کو آجائے
غرورِ گل کی نزاکت کا سب مٹا جائے

تبسمِ زلف سے سو جنّتیں مہک جائیں
نگاہِ مست سے میخانے تک بہک جائیں

وہ زلفِ تیرہ کہ دن ہو تو رات ہو جائے
سیاہ آنکھوں میں گُل کا نشان ہو جائے

وہ شوخ آنکھیں، جہاں بجلیاں مچلتی ہیں
وہ نظریں جن سے جواں مستیاں اُبلتی ہیں

کشیدہ ابرو، ہلالِ سیاہ کہئے جنہیں
کئی دلوں کا مآلِ سیاہ کہئے جنہیں

شفق سے، گل سے، سمن سے بنے ہوئے عارض
بہارِ باغِ عدن سے بنے ہوئے عارض

وہ لعلِ لب کہ جنہیں آرزوئیں پیار کریں
بہشتیں، غنچوں کی شادابیاں نثار کریں

خرامِ ناز، کہ موجِ نسیم رُک جائے
صدائے شوخ کہ قدموں پہ زہرہ جُھک جائے

بُتانِ شہر میں وہ اس طرح نمایاں ہے
کہ جیسے تاروں میں ماہِ جواں درخشاں ہے

نسیم کی طرح جس دم چمن میں آتی ہے
چمن کی ہر کلی مدحت کے گیت گاتی ہے

وہ پھول ہے، کہ بہاروں کا جس پہ پایہ ہے
وہ چاند ہے کہ ستاروں کا جس پہ سایہ ہے

بہ رنگِ مدح یہ "تازہ کلام" حاضر ہے
اور اس زباں میں جوابِ "سلام" حاضر ہے

امیدِ دل کی کلی کھل کے پھول ہو جائے

ہماری نذرِ محبّت، قبول ہو جائے!

سرزمینِ عشق

اک سرزمینِ عشق ہے!

ہنگامۂ عالم سے دُور، آفت گہِ ہستی سے دُور

اس مکر کی دُنیا سے دُور، اس ظلم کی بستی سے دُور

اس رات، اس دن سے الگ، اس اوج اس پستی سے دُور

دُور از زمین و آسماں

اِک سرزمینِ عشق ہے

اس کے گلستاں پُر فضا، اس کی بہاریں دل نشیں

اس کی زمینیں خوشنما، اس کی فضائیں مرمریں

اس کے نظارے دل کشا اس کی ہوائیں عنبریں

مثلِ بہشتِ گل فشاں اک سرزمینِ عشق ہے

ہاں یہ بہشتی سرزمیں اک سازِ وجد انگیز ہے

جس کے سنہری پردوں میں ہر نغمہ خواب آمیز ہے

اور "دیوتائے عشق" کی پرواز سے لبریز ہے

ہم رنگِ خوابِ رائگاں اک سرزمینِ عشق ہے

اک وادئ اسرار ہے، اک جلوہ گاہِ ناز ہے

جس کی فضا میں موجزن اک سرمدی آواز ہے

اور جس کا ہر نغمہ گدازِ روح کی پرواز ہے

ہمتائے بوئے گلستاں اک سرزمینِ عشق ہے

دُعا

مجسّمہ فرض کرکے!

تاروں بھری رات سو رہی ہے فطرت مدہوش ہو رہی ہے

ہیں وادی و کوہسار خاموش ہر پھول، ہر آبشار خاموش

اس اُجلے محل میں اک پری ہے گویا کوئی شکل مرمری ہے

کم سن، معصوم، بھولی بھالی چہرے پہ گلاب کی سی لالی

اک دُکھ بھرا گیت گا رہی ہے روتی ہوئی اُڑتی جا رہی ہے

پھیلائے ہوئے ہے اپنا دامن — ہونٹوں پہ ہے دل گداز شیون

بکھرے ہوئے بال اُڑ رہے ہیں — ظلمات کے جال اُڑ رہے ہیں

غمگیں نظریں اُٹھا رہی ہے — اور تاروں کی سمت جا رہی ہے

خالق کے حضور میں چلی ہے — کچھ رحم کی بھیک مانگتی ہے

آنکھوں میں چھلک رہے ہیں آنسو — گالوں پہ ڈھلک رہے ہیں آنسو

ساز زخمی کی ہے صدا یہ

ٹوٹے ہوئے دل کی ہے دعا یہ

اِندر سبھا میں

بے نقاب سامنے آکر چلی گئیں
بجلی سی میرے دل پہ گرا کر چلی گئیں!

سینے میں سو رہی تھیں جوانی کی حسرتیں
نظروں کی پنکھیوں سے جگا کر چلی گئیں

تھا صبر کی شراب سے لبریز جامِ دل
بیدردیوں کے ٹھیس لگا کر چلی گئیں

جادو سا کر رہی تھیں نشیلی نگاہ سے
ساری "سبھا" کو اپنا بنا کر چلی گئیں

یوناں کے شوخ و شنگ کمان دار کی طرح
ننھا سا ایک تیر چلا کر چلی گئیں

ایک ایک کو کنول سی وہ سرشار انکھڑیاں
مستی کے دو دو جام پلا کر چلی گئیں

دل کے سیاہ خانے میں برقِ جمال سے
ارمان کا چراغ جلا کر چلی گئیں

میرے ہر اک خیال کی دنیا بدل گئی
کچھ ایسا خواب مجھ کو دکھا کر چلی گئیں

سینے میں ہلکی ہلکی نگاہوں کے وار سے
اک میٹھا میٹھا درد اُٹھا کر چلی گئیں

رنج و الم کے حسرت و ارماں کے، ہجر کے
کیا کیا کھلونے دل کو دلا کر چلی گئیں

سرشار آنکھ، نیند کی مستی، خمارِ حسن
لاکھوں شراب خانے لُٹا کر چلی گئیں

آنکھیں سی کُھل گئیں کہ وہ منظر بدل گیا
پردہ سا سامنے سے اُٹھا کر چلی گئیں

کعبے کا راستہ مرے دل سے بُھلا دیا
بیت الصّنم کی راہ دکھا کر چلی گئیں

اُن انکھڑیوں کی یاد میں اس طرح مست ہوں
گویا مجھے شراب پلا کر چلی گئیں

رنگیں لباس کی نظر آشوبیاں نہ پُوچھ
محفل پہ اپنا رنگ جما کر چلی گئیں

دُہرا رہا ہوں اب تک اُنہی کے خیال کو
اللہ کیا سبق وہ پڑھا کر چلی گئیں

وہ جس طرف چلی ہیں، اُدھر یوں چلا ہوں میں
گویا وہ چلتے چلتے بُلا کر چلی گئیں

مجھ کو، کہ پہلے اپنی نظر میں کچھ اَور تھا
کچھ اَور سے کچھ اَور بنا کر چلی گئیں

کب آئیں، کب گئیں، مجھے اختؔر خبر نہیں
ہاں اتنا ہوش ہے کہ بس آ کر چلی گئیں

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبّت سے اشارے!

اے وادیٔ گنگا، ترے شاداب نظارے!

یہ بکھرے ہوئے پھول، یہ نکھرے ہوتے تارے!

خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے!

یہ چاندنی رات اور یہ پُرخواب فضائیں!

اک موجِ طرب کی طرح بیتاب فضائیں

سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں

مہکے ہوئے نظارے ہیں، بہکے ہوئے تارے!

یہ تارے ہیں یا نور کے پیمانے ہیں روشن
معصوم پری زادوں کے کاشانے ہیں روشن
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں روشن
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے!

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے!

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
گلزار ہیں گلریز، گہر بار ہوائیں
ہیں نور میں بھیگی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بال فشاں، مستیِ نکہت کے نظارے!

ساحل ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں

دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں

فردوس کی مستانہ بہاروں کے شبستاں

آختر کی تمنّا ہے یہیں رات گزارے!

عشق و آزادی

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے

عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے

عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی

لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

سلمیٰ

نورجہاں کے مزار پر

فضائے غم میں مسرت سی جھلملائی ہے خزاں کی شام پہ صبحِ بہار چھائی ہے

مزار نورجہاں پر وہ شوخ آئی ہے!

گماں ہے خلد سے حورِ جناں نکل آئی نقابِ گُل سے شمیمِ نہاں نکل آئی

کہ اپنی قبر سے نورجہاں نکل آئی

اندھیرے مقبرے میں غم سے یوں پریشاں ہے فضا کی گود میں گویا کہ شمعِ گریاں ہے

شبِ سیاہ میں سیارہ اشک افشاں ہے

طلائی ہاتھ اُٹھے کس کے فاتحہ کے لئے　　فضائیں ہو گئیں بیتاب التجا کے لئے
خدائی کانپ اُٹھی جذبۂ دُعا کے لئے

یہ رنگ دیکھ کے رنجور ہو رہا ہوں میں　　شرابِ درد سے مخمور ہو رہا ہوں میں
بیانِ حال پہ مجبور ہو رہا ہوں میں

گداز دل ہیں جنوں سر میں لب پہ شیون بھی　　وہ شیون آہ کہ رو دے وہ چشمِ پُر فن بھی
مگر میں کیا کروں ہے ساتھ شیر افگن بھی

الٰہی گر اسے نورِ جہاں بنانا تھا　　مرے نصیب کو یوں کامراں بنانا تھا
مجھے بھی خسروِ ہندوستاں بنانا تھا

کہ ایک دن یہی نورِ جہاں مری ہوتی　　جو آج غیر کی ہے دلستاں مری ہوتی
یہ غمزدہ بدلِ شادماں مری ہوتی

یہ کس نے چپکے سے تربت کی سمت اشارہ کیا　　بتا کے حسن کا انجام دل دوپارہ کیا
اور اپنا رازِ غمِ عشق آشکارہ کیا

یہ کس کو شکوہ ہے تربت کی بے نوائی کا مزارِ شوہرِ ملکہ کی خوش نمائی کا

اور اس کے ساتھ ہی مردوں کی بیوفائی کا

اُٹھی ہیں قبر پہ یہ کس کی سوگوار آنکھیں کہ ذرّے ذرّے کی ہیں غم سے بیقرار آنکھیں

فضا میں کچھ نہیں باقی پہ اشکبار آنکھیں

شعاعِ ماہِ جواں کو نگار دیکھا ہے؟ شمیمِ خلد کو ماتم گسار دیکھا ہے؟

کسی نے حُسن کو یوں سوگوار دیکھا ہے؟

شکوہ!

میری خوابیدہ امیدوں کو جگایا کیوں تھا؟ دل جلانا تھا تو دل تم نے لگایا کیوں تھا؟

مجھ کو اس طرح گرانا تھا اگر نظروں سے پھر مرے عشق کو سینے میں بسایا کیوں تھا؟

اک "شکستہ سا کھلونا" ہی سہی دل میرا اس کو تحفے کی طرح تم نے منگایا کیوں تھا؟

غیر کی یاد کو ممنون اگر کرنا تھا! خلوتِ دل میں مرے غم کو بسایا کیوں تھا؟

عشق تھا تم کو تو دل میں اسے پنہاں رکھتیں اپنا یہ رازِ حسیں مجھ کو بتایا کیوں تھا؟

"چاندنی راتیں" الفت کا سبق "دینے کو مجھ کو "جمنا" کے کناروں پہ بلایا کیوں تھا؟

عمر بھر پاس نہ آنے کا ارادہ تھا اگر پھر مجھے دُور سے دیوانہ بنایا کیوں تھا؟

میری راتوں میں سمائے ہیں تمہارے کاکل
تم نے یہ خواب مجھے آہ دکھایا کیوں تھا؟

یاس کی نیند سُلانا ہی اگر تھا منظور
میری امید کی راتوں کو جگایا کیوں تھا؟

اتنی خود دار اگر تھیں تو مرے دل کے عوض
اپنا سب کچھ مرے قدموں پہ گرایا کیوں تھا؟

تلخ انجامیٔ الفت سے اگر ڈرتی تھیں
یہ خطرناک سبق مجھ کو پڑھایا کیوں تھا؟

رُوٹھ جانا ہی اگر حُسن کا شیوہ ٹھہرا
میری رُوٹھی ہوئی قسمت کو منایا کیوں تھا؟

"آؤ اب صُلح کریں، عشق کریں، پیار کریں"
مجھ کو یہ زمزمۂ شوق سُنایا کیوں تھا؟

ولولہ اپنی محبّت کا گھٹانا تھا اگر
حوصلہ میری تمنّا کا بڑھایا کیوں تھا؟

اُٹھ نہ سکتا تھا اگر صدمۂ فرقت تم سے!
پھر مرے دل کا عبث ناز اُٹھایا کیوں تھا؟

نالۂ درد کی تلخی سے اگر نفرت تھی
بربطِ عشق کے تاروں کو جگایا کیوں تھا؟

لب پہ اس طرح لگانی تھی اگر مہرِ سکوت
پھر مجھے نغمۂ اُمّید سُنایا کیوں تھا؟

بے نیازی ہی سکھانی تھی اگر جلوؤں کو
میرے خوابوں کی فضاؤں کو بسایا کیوں تھا؟

نامۂ شوق ہمیشہ جو نہ لکھ سکتی تھیں
"بندگی نامہ" عبث ہم سے لکھایا کیوں تھا؟

پاس کرنا تھا اگر اپنی نزاکت کا نہیں
دل پہ پھر بارِ غمِ عشق اُٹھایا کیوں تھا؟

وادیوں میں لئے پھرنا تھا اگر شوقِ شکار
دُور سے میری طرف تیر چلایا کیوں تھا؟

بادہ عشق میں ایسی ہی اگر تلخی تھی ؟
پہلے اس جام کو ہونٹوں سے لگایا کیوں تھا؟

گر نظر آتی تھی دشوار وفا کی منزل
پھر قدم راہِ محبت میں اُٹھایا کیوں تھا؟

میرے سجدوں کے لئے اور ٹھکانے تھے بہت
آستاں اپنا مجھے تم نے بتایا کیوں تھا؟

الغرض عشق کا بھولا ہوا یہ تلخ سبق
بھولنے والی! مجھے یاد دلایا کیوں تھا؟

وقت کی قدر

(دعوت)

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ !

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ
چمن کی گود میں آ کر سما بھی جا سلمیٰ

کلی کلی میں بہاریں بسا بھی جا سلمیٰ
مجھے جنوں کا سبق پھر پڑھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ !

ملیں گے حشر میں مت کہہ یہ بار بار مجھے ہو کیسے حشر کے وعدے پہ اعتبار مجھے؟
خدا کے دل پہ نہیں کوئی اختیار مجھے خدا کو مان، یہیں حشر اُٹھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

نشاطِ عمر کو امید پر نثار نہ کر وصالِ صبحِ قیامت کا انتظار نہ کر
ریاضِ خلد کی باتوں کا اعتبار نہ کر فریبِ وعدۂ فردا مٹا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں فضائے روضۂ جنّت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت میں ہم ملیں نہ ملیں کشاکشِ ابدیت بھلا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں نظر نہ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
یہ نکہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں فضا میں خوابِ حسیں بن کے چھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

خبر لے جلد کہ عمرِ عزیز فانی ہے — سرائے دہر کی ہر چیز آنی جانی ہے
برنگِ ابرِ رواں فصلِ نوجوانی ہے — چھلکنے والا ہے ساغر پلا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

کسے خبر یہ گھٹائیں رہیں رہیں نہ رہیں — یہ نکہتیں یہ ہوائیں رہیں رہیں نہ رہیں
یہ مستیاں یہ فضائیں رہیں رہیں نہ رہیں — شرابِ وصل کا ساغر پلا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

ثباتِ عہد زمانے میں کس نے پایا ہے — زمانہ رنگ بدلنے کو رنگ لایا ہے
بہارِ عمرِ رواں بادلوں کا سایا ہے — بہارِ عمر کی خوشیاں منا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

ترے خیال کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں — خدائی ہو کہ خدا ہو بھلائے بیٹھے ہیں
سرورِ عہدِ جوانی لٹائے بیٹھے ہیں — تو آ کے قدرِ جوانی سکھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

یہ فصل اور یہ بہاریں نظر نہ آئیں گی پھر ۔۔۔ یہ بادلوں کی قطاریں نظر نہ آئیں گی پھر
یہ ہلکی ہلکی پھواریں نظر نہ آئیں گی پھر ۔۔۔ شرابِ عیش و مسرت لنڈھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ !

بتا تو کیا یہ نظارے اُجڑ نہ جائیں گے ؟ ۔۔۔ یہ ندیاں یہ کنارے اُجڑ نہ جائیں گے ؟
یہ چاند اور یہ ستارے اُجڑ نہ جائیں گے ؟ ۔۔۔ ستارہ وار شعاعیں لٹا بھی جا سلمیٰ !

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ !

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے ۔۔۔ خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گزار دی ہیں یونہی زندگانیاں ہم نے ۔۔۔ دمِ اخیر تو غم سے چھڑا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ !

فنا نصیب ہیں یہ سبزہ زار کے منظر ۔۔۔ یہ کوہسار و لبِ جوئبار کے منظر
نظر نہ آئیں گے پھر یہ بہار کے منظر ۔۔۔ ابھی سماں ہے بہاریں دکھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ !

خبر لے جلد کہ بہکی ہوئی بہار ہے آج نشاطِ خلد سے معمور سبزہ زار ہے آج!
اجل پہ بھی مری مستی کو اختیار ہے آج غرورِ عشق کی ہمت بڑھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

تو حکم دے تو ستاروں کو چھین لاؤں میں فلک سے اُس کے نظاروں کو چھین لاؤں میں
ارم کی مست بہاروں کو چھین لاؤں میں خدائی کو یہ تماشا دکھا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

تو سامنے ہو تو کون و مکاں کو گم کر دوں خمِ طرب میں خمِ آسماں کو گم کر دوں
دوئی ہو فرد تو دونوں جہاں کو گم کر دوں بہ رنگِ روح بدن میں سما بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

ایک خط کی رسید

جنتِ حُسن کی بُو، حُورِ صبا لاتی ہے
چار سُو رقص کناں مستی و رعنائی ہے
میرے افکار پہ پھولوں کی گھٹا چھائی ہے
وادیٔ سندھ سے اک دعوتِ عشق آئی ہے
کوئی سلمیٰ، مرے سجدوں کی تمنائی ہے!
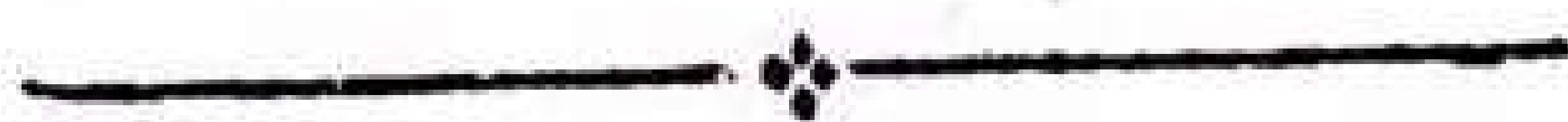
کس نے لکھا ہے کہ "تم سندھ کو کیوں بھول گئے"؟

"سب میں چرچا ہے کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے"؟

"سخت شکوہ ہے کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے"؟

کس نے پوچھا ہے کہ "تم سندھ کو کیوں بھول گئے"؟

کیسے بتلاؤں کہ اندیشۂ رسوائی ہے؟
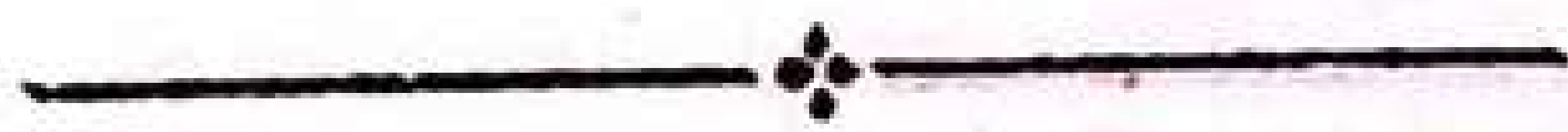
جس کے ذرّوں پہ فدا ہیں مہ و خورشید و فلک

جس کے ہر پھول پہ قربان ہے فردوس تلک

کھاتے ہیں جس کی لطافت کی قسم، حُور و ملک

جس نے دیکھی تھی کبھی تیغِ محمدؐ کی جھلک

اب وہ میداں مرے خامے کا تماشائی ہے!
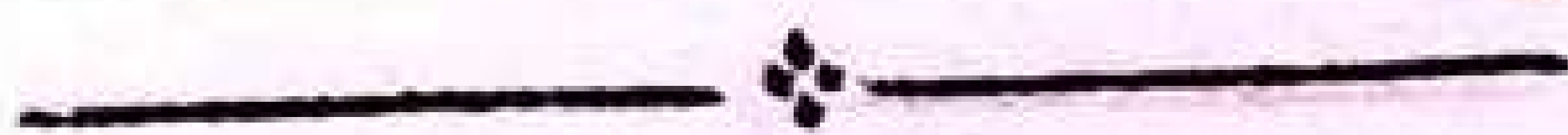
غائب از چشم ہے پھر جلوہ نما ہے یہ کون؟
نظر آتا نہیں، نظروں میں چھپا ہے یہ کون؟
دل کو معلوم نہیں، دل میں بسا ہے یہ کون؟
دُور سے کان میں یوں نغمہ سرا ہے یہ کون؟

کن طلسمات میں حیرت مجھے لے آئی ہے!

کون آمادہ ہے سینے میں در آنے کے لئے؟
دل کے ظلمت کدے میں شمع جلانے کے لئے؟
شامِ افکار کو خوشبو سے بسانے کے لئے؟
کون بے پردہ ہوا جلوے لٹانے کے لئے؟

کہ تصوّر کو خیالِ چمن آرائی ہے!

لکھا ہے تو سندھ بھی وعدے کو وفا کر دے گا"

"تم اگر یاد کرو گے، حق ادا کر دے گا"

"صلۂ عشق، شبہ حسن عطا کر دے گا"

"درد دل خوب بڑھاؤ کہ دوا کر دے گا"

یہ حقیقت ہے کہ یا رب سخن آرائی ہے!
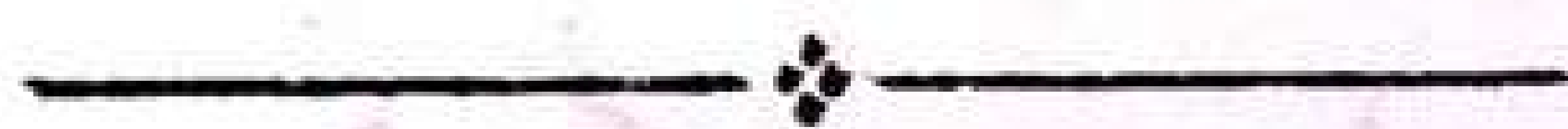
عشق کے ولولے پھر جاگ اُٹھے سینے میں

نقش ارماں پھر اُبھر آئے اس آئینے میں

لطف آنے لگا صہبائے جنوں پینے میں

لذتیں خلد کی پیدا ہوئیں پھر جینے میں

شوق و امید کے پھولوں میں بہار آئی ہے!

بعض رومانی لمحات کی یاد

در عنفوانِ جوانی چنانکه افتد دانی . . . .
(سعدیؒ)

عشق کا موسم، غم کی ہوائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

دل میں تمنّا لب پہ دعائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

یاروں کا گہری نیند میں سونا، دل کا کسی کی یاد میں کھونا

شوق کو بے ضد سب کو جگائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

عشق کی نادانی کا فسانہ، عقل کی حیرانی کا زمانہ

سر میں جنوں، آنکھوں میں حیائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

شوق کی پہلی نیند اُچٹنا، عشق کی پچھلی رات نہ کٹنا

دل میں امیدیں لب پہ دُعائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

دُور سے اُن کو دیکھتے رہنا، منہ سے مگر اک حرف نہ کہنا

سادہ نگاہیں بھولی ادائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

پاک سُہانی گھر کی فضائیں، بوئے حنا سے مست ہوائیں

صحن میں بنتِ عم کی صدائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

چاندنی راتیں سوتی ہوئی سی، نیند میں فطرت کھوئی ہوئی سی

مست فضائیں، سرد ہوائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

گھر پہ کسی کے رات گزرنا، اور وہ اُس کا صبح کو ڈرنا!

"دیکھو کنیزیں دیکھ نہ پائیں" اُف رے جوانی، ہائے زمانے

جھولے پہ اُن کو چھیڑتے رہنا، اور وہ اُن کا نا نہ سے کہنا
آپ نہ جھولا اب سے جھلائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

اُن کا بُلانا آپ نہ جانا، راہ دکھانا رات جگانا!
"تاکہ ابھی وہ اَور منائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

صحنِ چمن اور بادہ پرستی، رات کا منظر، عالمِ مستی
قدموں پہ ساغر سر پہ گھٹائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

وہ مری راتیں بھکی ہوئی سی، وہ مری راتیں بہکی ہوئی سی!
مرنے کے دن، جینے کی دُعائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

ایک گلی سے روز گزرنا، گرچہ کسی سے بات نہ کرنا
سینے میں دھڑکن، منہ پہ ہوائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

گھر پہ وہ اک مہ پارہ کا آنا، بات نہ کرنا آنکھ چُرانا
دل کو خلش تنہا کبھی پائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

چاندنی اور دریا میں سفینہ، ہاتھ میں مینا ساتھ حسینہ
ساز کے لب پر مست صدائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

باغ کا وہ پھولوں سے مہکنا، وقت کا خوشبو بن کے لہکنا
چاندنی راتیں، مست ہوائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

گاؤں کے جس پنگھٹ پہ بھی جانا بے کھٹکے گاگر سر پہ رکھانا
ہنستی رہیں گھونگٹ میں ادائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

یادیں آنسو بہتے ہیں اختر کھوئے ہوئے سے رہتے ہیں اختر
دل سے سمے وہ کیسے بھلائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

عید کا چاند

عربی ریگستان میں

عرب کی شام کا دلکش سماں ہے　　فضا سے کیفِ رنگینی عیاں ہے
سُوئے منزل رواں اک کارواں ہے

مسافر ہیں، تھکے ہیں، جا رہے ہیں　　حُدی کے مست نغمے گا رہے ہیں
سکونِ دشت کو تڑپا رہے ہیں

یہ صحرا ہے کہ ہے دامانِ نکہت　　سوادِ شام ہے یا جانِ نکہت
بپا ہے چار سُو طوفانِ نکہت!

مسافر مست تھے کیفِ نوا سے کہ ماہِ عید نے جھانکا فضا سے

ہر اک بیخود ہوا ذوقِ دُعا سے

ہیں سجدے شُکر کے مضطر جبیں ہیں ہے سر خم ۔ گہ جاں آفریں میں

سر شکِ شوق ہیں چشمِ حزیں میں

ہلالِ عید بر روئے فلک ہے کہ قوسِ سیم ابروئے فلک ہے

طلائی کشتی اور جوئے فلک ہے

طراوت آ گئی موجِ صبا میں بہاریں کھیلتی ہیں اس فضا میں

بسی ہے عید کی نکہت ہوا میں

عرب کی شام کا دل کش سماں ہے فضا سے کیفِ رنگینی عیاں ہے

سوئے منزل رواں اک کارواں ہے

یادگارِ علی کرم

فرازِ چرخ سے ہمدوش افتخارِ علیؑ! — چراغِ مہر و مہ اک پرتوِ وقارِ علیؑ!

بہارِ باغِ جناں، خاکِ رہ گزارِ علیؑ — فضائے دہر ہے از یادِ سوگوارِ علیؑ!

قلم فدائے علیؑ ہے، زباں نثارِ علیؑ

علیؑ کی یاد ہے دنیا میں یادگارِ علیؑ

علیؑ کہ نقشۂ خیبر مٹا دیا جس نے — فضائے جنگ میں محشر جگا دیا جس نے

حصارِ چرخِ بریں کو ہلا دیا جس نے — جہاں کو تیغ کا جوہر دکھا دیا جس نے

ہے اب بھی یاد زمانے کو ذوالفقارِ علیؑ

علیؑ کی یاد ہے دنیا میں یادگارِ علیؑ!

وہ دلق پوش کہ سب بادشا کہیں جس کو — وہ خاکسار کہ شیرِ خدا کہیں جس کو!

وہ اُس کا خُلق کہ شمع ہُدا کہیں جس کو
وہ اُس کا نام کہ مشکل کشا کہیں جس کو

ہے فیض پرتوِ حق، خُلقِ لطف بارِ علیؑ
علیؑ کی یاد ہے دُنیا میں یادگارِ علیؑ

ذرا سی دیر میں کتنی صفوں کو صاف کیا
وہ اُس کی تیغ کہ جب رُخ سوئے مصاف کیا

وہ اُس کا رحم کہ قاتل کو بھی معاف کیا
کبھی نہ فطرتِ اخلاق کے خلاف کیا

ہے لُطف و رحم بھی سوجان سے نثارِ علیؑ
علیؑ کی یاد ہے دُنیا میں یادگارِ علیؑ

زبانِ شوق پہ تقدیس کا ترانہ ہے
سرِ نیاز ہے خالق کا آستانہ ہے

یہ موت، موت نہیں کیف عاشقانہ ہے
رگِ گلو ہے کہ جلّاد کا نشانہ ہے

مدام رحمتِ حق یاد ہمکنارِ علیؑ
علیؑ کی یاد ہے دُنیا میں یادگارِ علیؑ

انتظار

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

خوش ہوا ئیست فرح بخش خدایا بفرست　　نازنینے کہ بروئیش مۓ گلگوں نوشم

بہارِ کیف کی بدلی، اُتر آئے گی وادی میں
سرُورِ نُور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیمِ بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شبابِ حُسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

ابھی سے جاؤں اور وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں

بچھا دیں فرشِ گل وادی میں، گلزاروں سے کہہ آؤں

چھڑک دیں چاندنیاں، پھولوں کی مہکاروں سے کہہ آؤں

کہ سلمیٰ، میری سلمیٰ نور برسائے گی وادی میں!

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو وادی میں آئے گی

برائے سیر اس پھولوں کی آبادی میں آئے گی

غزالِ دشت بن کر رنگِ آزادی میں آئے گی

اور آ کر ناز کی بستی بسا جائے گی وادی میں!

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

بہارِ وادئ رنگیں کو یہ مژدہ سنا آؤں
زمیں کو نکہتِ گلہائے رعنا سے بسا آؤں
اور اُس پر نازنیں کلیوں کا اک بستر بچھا آؤں
کہ وہ نازک بدن ہے اور تھک جائیگی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

زمیں پر بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھا دے خاک پر اے آسماں اپنے ستاروں کو
خرام و رقص کا دے حکم فطرت، ابر پاروں کو
وہ بیخود چاند کی نظروں سے گھبرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

مرے آغوش میں ہوگا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اُس کے کاکلِ مشکیں، وہ روئے نازنیں اُس کا
وہ رخسارِ حسیں اُس کے، وہ حُسنِ یاسمیں اُس کا
وہ جس سے شوق کی دُنیا کو دہکائے گی وادی میں!
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!
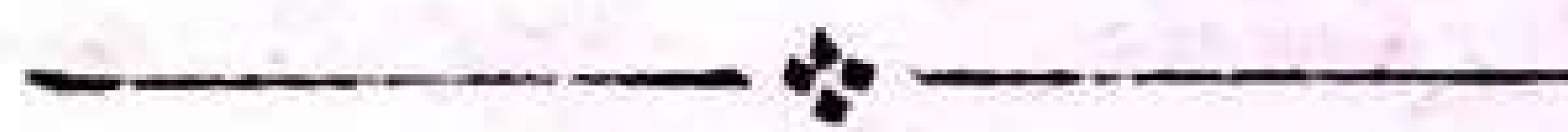
تمنّا و حیا کی کشمکش کیوں کر مٹاؤں گا
مَیں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گُدگُداؤں گا
اور اُس کے لعلِ لب سے کس طرح رنگت چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائیگی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

راہِ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے
خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

پھر اُٹھا وادیٔ جمنا سے وہی ابرِ بہار
جس کے سائے میں وہ خوشبوئے رواں آتی ہے

جس کے پہلو میں میسّر تھی کبھی راحتِ جاں
حرمِ جاں میں وہی راحتِ جاں آتی ہے

جسمِ پنجاب تھا بے روح و رواں مدت سے
جسمِ پنجاب میں پھر روحِ رواں آتی ہے

گُل و گلشن سے کہو خاکِ رہِ شوق نہیں
وہ گُلِ سر سبدِ گلبدناں آتی ہے

عندلیبانِ چمن گرمِ غزل خوانی ہوں
کہ بہار آتی ہے اور خلد فشاں آتی ہے

نو بہاروں سے کہو محوِ گل افشانی ہوں
کہ وہ رشکِ رُخِ نسریں بدناں آتی ہے

فرشِ گلبرگ بچھا دے رہِ گلشن میں نسیم
آج وہ نازشِ گل پیرہناں آتی ہے

نور برسائیں فضا میں مہ و انجم مل کر   کہ وہ غیرتِ وہ صد سیمتناں آتی ہے

کشتیٔ ماہِ زر افشاں پہ سرِ ابر رواں   مسکراتی ہوئی وہ ماہِ رواں آتی ہے

گلشنِ دہلی میں دل اس کا نہ بہلا شاید   سوئے لارنس جو وہ سروِ رواں آتی ہے

موجِ رفتہ کی طرح وہ رہتی جو راوی سے   لبِ راوی پہ وہی موجِ رواں آتی ہے

مٹنے والی ہے جہانگیریٔ شامِ فرقت   کہ سحر بن کے کوئی نور جہاں آتی ہے

لبِ شیریں کو سکھاتی تھی جو شیریں دہنی   پھر وہی حیرتِ شیریں دہناں آتی ہے

دامنِ دل کو سکھانے کے لئے درسِ جنوں   مصرِ دہلی سے زلیخائے جواں آتی ہے

نئی دہلی کی فضائیں تھیں معطر جس سے   سوئے لاہور وہ فردوسِ رواں آتی ہے

پھر مئے شوق سے سرشار ہوا ہوں اختر
پھر مرے لب پہ غزل رقص کناں آتی ہے
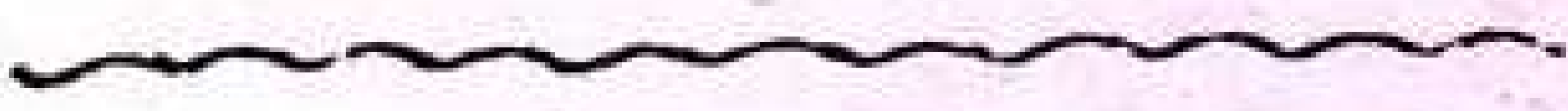
پیاری چلی جاؤگی کیا؟

مجھ کو تڑپتا چھوڑ کر، پیاری چلی جاؤگی کیا؟
میری نگاہِ شوق کو فرقت میں ترساؤگی کیا؟
اُف حشر تک یہ چاند سی صورت نہ دکھلاؤگی کیا؟
اور پھر نہیں آؤگی کیا؟
پیاری چلی جاؤگی کیا؟

کیا جنّتِ دیدار سے محروم ہو جاؤں گا میں ؟

اس محشرِ انوار سے محروم ہو جاؤں گا میں ؟

ہاں کیا تمہارے پیار سے محروم ہو جاؤں گا میں ؟

اُف، یہ ستم ڈھاؤ گی کیا ؟

پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟
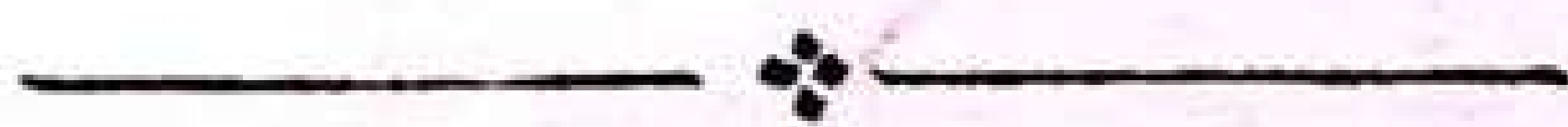
کیا سُن رہا ہوں آہ میں دشمن کے گھر جاؤ گی تم !

اور اس قفس سے پھر رہا ہونے نہیں پاؤ گی تم !

میری تسلّی کے لئے واپس نہیں آؤ گی تم !

سچ مچ نہیں آؤ گی کیا ؟
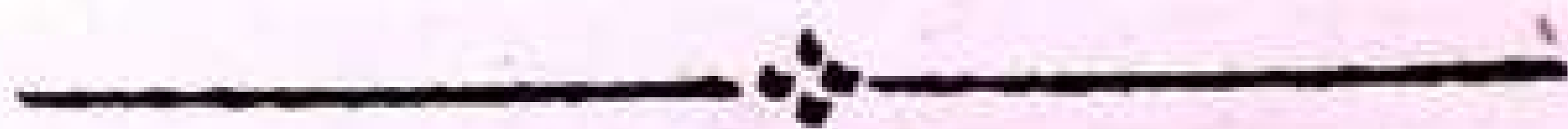
پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟

کیا یہ وفا ہے، بیوفا، ایسی وفا ہوتی ہے کیا؟
دُنیا میں رسم وعدہ اب یونہی ادا ہوتی ہے کیا؟
یہ ہے وفا تو وہ جو اک شے ہے، وفا، ہوتی ہے کیا؟

دل میں نہ شرماؤگی کیا؟
پیاری چلی جاؤگی کیا؟

کس کو خبر تھی، آسماں آتش فشاں ہو جائیگا
فردوس نذرِ آرزو، نذرِ خزاں ہو جائیگا
اور یہ گلِ طلعت نصیبِ دشمناں ہو جائیگا

دشمن کی ہو جاؤگی کیا؟
پیاری چلی جاؤگی کیا؟

تم جس کی قسمت میں ہو وہ فرخندہ اختر کون ہے؟
کہہ دو تمہارے عشق میں وہ میرا ہمسر کون ہے؟
وہ میرا دشمن لیکن اب، میرا مقدر کون ہے؟

مجھ کو نہ بتلاؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟
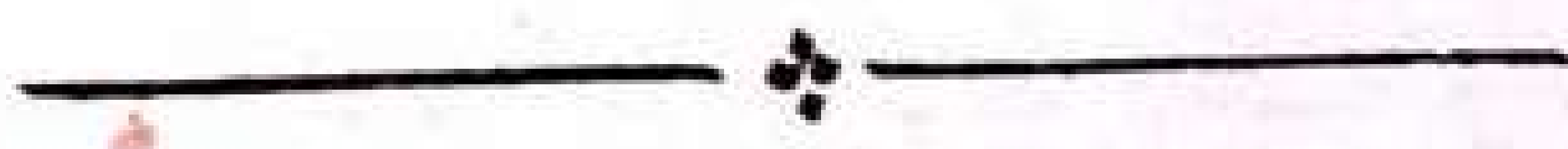
تم سے گِلہ، لیکن نہیں، اصلاً نہیں، حاشا نہیں
مجبور ہو، مجبور سے کچھ جبر کا شکوہ نہیں
لیکن کروں کیا، دل کو بھی تو ضبط کا یارا نہیں

کہہ دو کہ پھر آؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

شامِ بنگال

ایک ایسے مسافر کے نقطۂ نظر سے جو پہلے بھی کئی بار شامِ بنگال
سے لطف اندوز ہو چکا ہے

گنگناتی ہوئی، ہنستی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی
شامِ بنگال اُٹھی زلفوں کو بکھراتی ہوئی

چشمِ میگوں میں لئے خوابِ زلیخا کے ہجوم
چاکِ دامانیٔ یوسف کی قسم کھاتی ہوئی

یادِ ایام کے جذبوں کو جگا کر دل میں
پھول کی طرح مری یاد کو مہکاتی ہوئی

بھر کے دامن میں حسینوں کا لہکتا ہوا نور
قصۂ طور کو ہر گام پہ دہراتی ہوئی

سارے غم بھول کے، اک عالم سرمستی میں
قہقہہ بن کے ہر اک ہونٹ پہ لہراتی ہوئی

خاکِ کلکتہ پہ برسا کے شمیم و مستی!
میری گزری ہوئی راتوں کی قسم کھاتی ہوئی

تازہ ہو کر مرے خوابوں میں ستاروں کی طرح
بھولے بسرے ہوئے کچھ خواب سے دکھلاتی ہوئی

ہر قدم پہ نئے جلووں کو نمایاں کر کے
ہر قدم پر نئے بتخانے سے برساتی ہوئی

آ کے پہلو میں مرے، یوں گئی جیسے کوئی حور
بسترِ گل سے اٹھے صبح کو شرماتی ہوئی

اسلام کا شکوہ

مسلمانوں سے

اے مسلماں تیری وہ دیرینہ عظمت کیا ہوئی
وہ حمیت، وہ دلیری، وہ شجاعت کیا ہوئی

کفر زارِ ہند کا تجھ پر اثر کیوں ہو گیا؟
وہ عرب والوں کی اسلامی صداقت کیا ہوئی

یاس کی تاریکیوں میں راہ گم کردہ ہے تو
آج وہ اُمّید کی پُرنور صورت کیا ہوئی

جو نہ کرتی تھی تمیزِ بندہ و آقا کبھی
آہ وہ یکرنگیٔ جوشِ اخوت کیا ہوئی

جس کی کیفیت میں گم تھی روحِ سلمانؓ و بلالؓ
بادۂ عرفاں کی وہ مستانہ لذت کیا ہوئی

جن کی ہیبت سے کبھی کانپ اُٹھتے تھے روم و فرنگ
تیری تکبیروں کی وہ شیرانہ صولت کیا ہوئی

صفحۂ تاریخ پر جو آج تک تابندہ ہے — آج تیری وہ تسخیر خیز شوکت کیا ہوئی

جو چلا دیتی تھی خشکی پر کبھی سو سو جہاز — آج تیرے دست و بازو کی وہ ہمت کیا ہوئی

جس نے جا گاڑا تھا یورپ میں عَلَم اسلام کا — آہ تیرے بازوؤں کی اب وہ طاقت کیا ہوئی

سینۂ افریقہ تھا جس کا مزارِ دائمی — تیرے ماضی کی وہ طوفاں خیز عظمت کیا ہوئی

دجلہ و نیل آج تک ہیں جس کے غم میں اشکبار — وہ خلافت کیا ہوئی؟ وہ اسکی سطوت کیا ہوئی

روک سکتا تھا نہ کوئی جن کو بحرِ بیکراں — تیرے وہ بیٹے کہاں ہیں؟ اُن کی قوت کیا ہوئی

رو رہے ہیں آج تک جس کو کھنڈر اسپین کے — وہ حکومت کیا ہوئی؟ وہ اسکی شوکت کیا ہوئی

یاد کر للہ! آج اُن رفعتوں کو یاد کر — تیرے دل کو کیا ہُوا، اُسکی وہ غیرت کیا ہوئی

اُٹھ ہلا کر دل کو خوابِ عیش کی زنجیر سے
گونج اُٹھیں پھر فضائیں نعرۂ تکبیر سے

ہرجائی

عشق میں تجھ کو بھی اپنا ہمزباں سمجھا تھا میں
تیرے دل کو دردِ دل کا رازداں سمجھا تھا میں
آہ اُس دن جبکہ تو پہلے پہل آ کر ملی ! !
ساری پچھلی زندگی کو رائگاں سمجھا تھا میں
ہائے وہ رات اور وہ اُس رات کی رنگینیاں
جس کے ہر لمحے کو عمرِ جاوداں سمجھا تھا میں
دامنِ کہسار میں ہر سمت وہ خوابیدہ پھول
ذرّے ذرّے کو چمن سازِ جناں سمجھا تھا میں

صحنِ گلشن میں ترا حسنِ خراماں دیکھ کر
تجھ کو اک سیارۂ بے آسماں سمجھا تھا میں

آہ وہ رنگیں فضا، وہ چاندنی وہ بے خودی
اس سمے میں تجھ کو اک حورِ جناں سمجھا تھا میں

گونجتا ہے اب بھی کانوں میں ترا اظہارِ عشق
جس کو اُس رات اک سرودِ آسماں سمجھا تھا میں

پھرتے ہیں آنکھوں میں وہ بے تاب آنسو آج بھی
جن کو تیرے رنج و غم کا ترجماں سمجھا تھا میں

چاند کی کرنوں سے گھبرا کر وہ خلوت کی تلاش
جس کو اپنے ضبط کا اک امتحاں سمجھا تھا میں

پھر وہ خلوت میں ہم آغوشی کی پنہاں کوششیں
تیری بے تابی کا جن کو رازداں سمجھا تھا میں

مینہ برستے میں وہ لے جانا بیاباں کی طرف

جن کو تیری وحشتوں کا ترجماں سمجھا تھا میں

وہ تری مستی بھری لَے اور وہ رنگیں غزل

جس سے تیرے ذوقِ شعری کو جواں سمجھا تھا میں

شکوہ کرنا چشمِ میگوں کا وہ لحنِ مست سے

جس کو صرف اک شوخیٔ نازِ بتاں سمجھا تھا میں

وعدہ لینا راز داری کا وہ ہنگامِ وداع

جس کو تیری پاکبازی کا نشاں سمجھا تھا میں

آج اے ..... مگر آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا

ایک دھوکے کو حقیقت کا نشاں سمجھا تھا میں

اے چشمِ میگونِ تو گویاست کہ صہبا زدہ ای

نوشِ جاں باد ولے حیف کہ بے ما زدہ ای"

تھا ترا زریں پیکر اک بساطِ رہ گزر !!
جس کو آغوشِ حریمِ کہکشاں سمجھا تھا میں

تیرا جسم اک زخم تھا اک زخمِ پنبہ در دہاں
جس کو انبارِ حریر و پرنیاں سمجھا تھا میں

تیرے سینے میں تھا رقصاں حرص کا آتشکدہ
جس کو نورِ شمعِ عشقِ جاوداں سمجھا تھا میں

تیرے ہونٹوں سے اُبلتی تھی ہوس کی تیرگی
جس کو غم کی پاک آہوں کا دھُواں سمجھا تھا میں

تیرے پہلو سے نکلتی تھی گناہوں کی بھبک
جس کو بوئے دامنِ حورِ جناں سمجھا تھا میں

چاندنی کی طرح ارزاں تھا ترا حُسن و شباب
جس کو اک دن چاند سے بڑھ کر گراں سمجھا تھا میں

تیرے ذوقِ شعر سے مُنکر نہیں لیکن اسے

آسمانی رفعتوں کا ترجماں سمجھا تھا میں

تیرا اک اک سانس تھا اک دوزخِ حرص و ہوا

لیکن اس کو سوزِ الفت کا نشاں سمجھا تھا میں

کون واقف تھا تری ہستی ہے وقفِ این و آں

آہ تجھ کو ماورائے این و آں سمجھا تھا میں

تیرے ہونٹوں پر نہیں عفّت کے لہو کی سُرخیاں

جن کو روحِ غنچہ ہائے ارغواں سمجھا تھا میں

آہ تُو نکلی فریبِ حُسن کی زندہ مثال

تجھ کو اک حُسنِ حقیقت ترجماں سمجھا تھا میں

تُو وہ ساغر تھی ہر اک کے ہونٹ جس کو چھُو سکیں

ساغرِ خورشید و مہ کا ہمعناں سمجھا تھا میں

ہر مکاں نکلا تری جلوہ گری سے آشنا

تیرے ہر جلوے کو نورِ لامکاں سمجھا تھا میں

ایک ناگن بن کے لہراتی ہے تُو افکار میں

حُسن کی اک سلسبیلِ بے کراں سمجھا تھا میں

چودھویں سالگرہ کا تحفہ

ستارے نذر کروں، آفتاب نذر کروں؟ | کلی کا حُسن، گُلوں کا شباب نذر کروں؟

ریاضِ خلد کی شادابیاں کروں حاضر؟ | نگاہِ حُور کا رنگیں حجاب نذر کروں؟

صباحتِ رخِ شیریں کا ارمغاں بھیجوں؟ | لبِ سلیمٰی کا لعلِ خوش آب نذر کروں؟

غزالِ دیدۂ لیلائے نجد بھجوا دوں؟ | خمارِ چشمِ زلیخا کا خواب نذر کروں؟

کھلونا چاہئے گر کوئی کھیلنے کے لئے
چُرا کے زہرہ کا زرّیں رباب نذر کروں؟

بہ بس ہے وہ کہ ستاروں سے بھی ہی پڑھ ضرور
شعاعِ مہر کا زرّیں نقاب نذر کروں؟

مطالعے کی تمنّا ہو گر نگاہوں کو
تو کہکشاں کی طلائی کتاب نذر کروں؟

مذاقِ شعر کی لازم اگر رعایت ہو
تو شاعرانِ جہاں کا جواب نذر کروں؟

زبسکہ سالگرہ چودھویں ہی حسرت ہے
کہ میں بھی چودھویں کا ماہتاب نذر کروں؟

قبول ہوں نہ یہ تحفے تو کیا کروں آخر؟
کہو تو میں دلِ خانہ خراب نذر کروں؟

اڈیٹر کی شان میں!

اُردو اخبار نویسوں کا تعارف

قلم ہے ہاتھ میں، سگریٹ ہے منہ میں، تن کے بیٹھے ہیں
صحافیات کی کرسی پہ یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
متانت، لاکھ مصنوعی ہو، لیکن شبہ ہوتا ہے
وزیرِ ہند، وائٹ ہال میں لندن کے بیٹھے ہیں
غمِ ملت میں چہرے سے عیاں ہے موت کی سختی
مطب میں آپ گویا ڈاکٹر برمن[1] کے بیٹھے ہیں

---

[1] کلکتہ کے احباب خصوصاً داد دیں۔

بس اب انگریزی اخباروں کی شامت آنے والی ہے

کہ قینچی ہاتھ میں ہے، بل جبیں پر، تن کے بیٹھے ہیں!

اکڑ فوں ان کی کہتی ہے بنا لو کارٹون آ کر

کہ ہم بن کر بھتیجے قیصرِ[1] جرمن کے بیٹھے ہیں

ہزاروں ہند اور ایران قرباں ان کے تیور پہ

گماں ہوتا ہے کوئی جانشیں کرزن کے بیٹھے ہیں

چمک آنکھوں کی گر تقریر کے عالم میں ظاہر ہو

تو ہو معلوم جہاں وادیٔ ایمن[2] کے بیٹھے ہیں

اگر غم خوارئ ملت کہیں ظاہر تو یہ شک ہو

بزرگِ خاندانی کوئی سن یٹ سن[3] کے بیٹھے ہیں

---

[1] قیصر کی مونچھیں یاد کر کے فاتحہ پڑھیے۔ [2] مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری کا تصور نہ کیا جائے ع پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

[3] کلکتہ کے چاندنا بازار سے رسیاں تڑا کر بھاگ نکلے ہیں۔

تحکّم آپ کا دیکھے تو نازی کو بھی ہو دھوکا
"مجسّم" صدر ہیں، مشروطۂ جرمن کے بیٹھے ہیں

اگر قومی مصائب کا بیاں چھیڑیں مجالس میں
تو شک ہو روضہ خواں کوئی کسی[1] مدفن کے بیٹھے ہیں

خطابیات کو گر رنگِ اُلفت سے رنگیں شک ہو
کہ پردادا آمنیزہ کے چچا بیژن کے بیٹھے ہیں!

اصولوں پر جو چھیڑیں بحث، امریکہ یقیں کر لے
کہ اُستادِ یگانہ حضرتِ[2] ولسن کے بیٹھے ہیں

اگر افسانہ چھیڑیں اقتصادیاتِ عالم کا!
تو ہو معلوم ابوالآبا کوئی لینن کے بیٹھے ہیں

---

[1] نہ ہوئے عارف قزوینی ہندوستان میں!

[2] جشن کو آج ان کی بری طرح ضرورت ہے ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

غرور آمیز نظریں پڑتی ہیں پبلک پہ یوں گویا،

کلینسر این۔ ڈبلیو۔ آر کے انجن کے بیٹھے ہیں

عتیقیات کے ماہر انہیں دیکھیں تو بول اٹھیں

کہ وارث تخت گاہِ خسرو و بہمن[1] کے بیٹھے ہیں

کوئی کاتب نہ مانگے ان سے مضموں بار بار آکر

کہ جوتہ بن کے اٹھیں گے، طمانچہ بن کے بیٹھے ہیں

عرب ہوٹل کا "خشکہ" ختم ہو جانے کو ہے بالکل

کہ چمچہ[2] ہاتھ میں ہے، منہ کھلا ہے، تن کے بیٹھے ہیں

لکھے ابنِ بطوطہ کب تلک تعریف حضرت کی

صحافیات کے گنبد پہ ہدہد بن کے بیٹھے ہیں

---

[1] قابل توجہ محکمۂ آثارِ قدیمہ ہند۔

[2] چمچہ یا چمچو؟ جناب سند باد جہازی مدیر مطائبات روزنامہ "احسان" توجہ فرمائیں ع آپ کا سر ہے سلامت تو ہزاروں چمچو!

بیوفائی زمانہ

(قطعہ)

شکستہ دلوں سے منارہ اک بنا دیں   اور اُس پہ سے بزمِ جہاں میں صدا دیں

کہ نو واردانِ بساطِ زمانہ   یہاں آ کے درسِ محبت بھلا دیں

دماغوں سے فکرِ وفا محو کر دیں   دلوں سے صداقت کے جذبے مٹا دیں

یہ باغ، ایسے پھولوں کے قابل نہیں ہے   خدارا اُمیدوں کی شمعیں بجھا دیں

خدائی ہے محروم صدق و صفا سے   خدائی میں صدق و صفا کو بھلا دیں

وہ سینے ہیں حساس دل جن میں لرزاں   انہیں سنگریزوں کا مسکن بنا دیں

وہ دل، جن میں ہیں عشق کے شعلے رقصاں اُنہیں خاکداں حسرتوں کا بنا دیں
وہ آنکھیں، ہے نورِ وفا جن میں روشن اُنہیں بے حسی آئینے کی سکھا دیں
وہ جذبات، اخلاص سے ہیں جو رنگیں اُنہیں نیرنگیٔ ریا سے چھُپا دیں
وہ افکار گہوارہ ہیں جو وفا کا اُنہیں شیوۂ بے وفائی سکھا دیں

کہ دُنیا ہے بیگانہ، عشق و وفا سے
پھر انسانیت منحرف ہے خدا سے

ایک تصویر دیکھ کر

یہ حسنِ نازنیں، یہ جلوۂ ناز آفریں تیرا
یہ معصومانہ چہرہ غنچۂ شاداب کا عالم
یہ مستانہ نگاہیں، اک بہشتی خواب کا عالم
سراپائے خیالِ حور، جسمِ نازنیں تیرا
مجسّم خندۂ خوابِ پری، روئے حسیں تیرا
یہ موتی، یہ جبیں، یا انجم و مہتاب کا عالم
پریشاں خواب کا سا گیسوئے شب تاب کا عالم
چمن زارِ شعاعِ نور، عکسِ دل نشیں تیرا

تُو از سر تا بپا اک نکہت و تنویر ہے سلمیٰ

شراب و شعر و موسیقی میں پنہاں تیری رنگت ہے
مرے خاموش دل میں موجزن تیری محبّت ہے
بہار اور خواب کا ہیکل، تری تصویر ہے سلمیٰ

ادا اس طرح فرضِ رونمائی کچھ تو کر جاؤں
تری تصویر سینے سے لگا لوں اور مر جاؤں

سلمیٰ

بہارِ حسن کا تُو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے

تری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمٰی

ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمٰی

شبستانِ جوانی کا تُو اک زندہ ستارہ ہے

تو اس دُنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے

تُو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمٰی

جہانِ قدس کا تو ایک فردوسی فسانہ ہے

تجھے مصرِ جمال و ناز کی اک ساحرہ کہئے

صنم آبادِ عفّت کی مقدس کافرہ کہئے

ربابِ حُسن کا تُو ایک الہامی ترانہ ہے

پرستانِ لطافت کی تُو اک رنگیں کہانی ہے

جوانِ فطرت کا تُو اک گمشدہ خوابِ جوانی ہے

ایک دوست کی خودکشی پر

آرزو تھی، ہم بھی دیکھیں تماشائے فنا
تھی مقدر، لیکن اس کی ابتدا تیرے لئے

کتنی آساں ہو گئی، راہِ فنا تیرے لئے
کھنچ گیا آنکھوں میں نقشِ حسنِ لیلائے فنا

پی گیا تو بے تامل، جامِ صہبائے فنا
خواب تھا، اک خواب ہے یہ ارض و سما تیرے لئے

ایک دھوکا تھا سکونِ زارِ بقا تیرے لئے
جنبشِ خنجر میں پوشیدہ تھی دنیائے فنا

غالبؔ و خیامؔ کے شعروں کا تو دیوانہ تھا
جن کے دیوانوں میں اک کیفِ رواں ہی زندگی
طائرانِ رنگ و بو کا کارواں ہے زندگی
اُن کی طفلانہ بقا سے تو مگر بیگانہ تھا!
حُسن تھا مطلوب اُن کو عمرِ فانی کے لئے
اور تیری موت حسنِ جاودانی کے لئے

ایک نوجوان بُت تراش کی آرزو

اک ایسا بُت بناؤں کہ دیکھا کروں اُسے
آسودہ ہے خیال کا پیکر بنا ہؤا
خوابِ عدم میں مست ہے جو ہر بنا ہؤا
اک مرمریں حجاب سے پیدا کروں اُسے

پھُولوں میں جیسے جذبۂ نکہت نہفتہ ہو
یا جلوے بیقرار ہوں امواجِ رنگ میں
یوں اُس کی روح خفتہ ہے آغوشِ سنگ میں
ظلمت میں جیسے نُور کی صورت نہفتہ ہو

دن رات، صبح شام، میں پُوجا کروں اُسے

میرا گداز روح، جبیں سے مچل پڑے

اُس کی نظر سے جذبِ محبّت اُبل پڑے

سازِ نفس کو توڑ کے گویا کروں اُسے

فن، خوابِ مرگ بن رہے بُت ساز کے لئے

دُنیا پکارتی رہے آواز کے لئے

"پُپّ" کا نغمہ سُن کر!

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا

شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
اُفق پر موجزن مستانہ خوابوں کی ہوائیں ہیں

فضا میں بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا!
خلا میں پر فشاں ہیں حُسن کی شہزادیاں گویا!

بہار و کیف سے لبریز فردوسی ہوائیں ہیں
اور اُن میں منتشر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں

مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا!

وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نغمات برستے ہیں

شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں

ستاروں کے سمندر، ماہتابوں کے جزیرے ہیں

بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں

فضا ہے مست، موجِ نکہتِ بادِ بہاری سے

اور اس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

دُنیا کی بہاریں

یہ دُنیا، یہ نظارے اور یہ رنگینی فضاؤں میں

یہ جلوے چاند سورج کے، یہ تابانی ستاروں کی

یہ نزہت لالہ زاروں کی یہ رفعت کوہساروں کی

یہ بھینی بھینی آوارہ سی خوشبوئیں ہواؤں میں

یہ بکھری بکھری مستی جھومنے والی گھٹاؤں میں

یہ تیزی آبشاروں کی، روانی جوئباروں کی

یہ پھولوں کا ہجوم اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی

یہ موسیقی جو رقصاں ہے پرندوں کی صداؤں میں

یہ نغمے، یہ ترانے، یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی، یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی، یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں، یہ بہاریں، یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب! یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنّت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو!

کلوپیٹرا

وادیٔ نیل پہ طاری تھا بہاروں کا سماں
جلوۂ سبزہ و گل سے تھیں فضائیں شاداب
نشۂ بادِ بہاری سے ہوائیں شاداب

محوِ پروازِ نغمہ رنگین ستاروں کا سماں

مائلِ رقص ہو جس طرح شراروں کا سماں!

نورِ انجم سے نفیس منظر کی ادائیں شاداب

نکہت و رنگ کی آوارہ گھٹائیں شاداب

چار سُو، بال فشاں میکدہ زاروں کا سماں

یک بیک اک شفق اندام ستارہ ٹوٹا!

بن کے اک غنچۂ زرکار گرا وادی میں

اور اک خواب نما پھول گرا وادی میں

دیکھتے دیکھتے نیرنگِ نظارہ ٹوٹا!

جلوۂ فطرتِ رنگیں کی نئی تنویر اُس میں

ایک عورت کی پریشان نئی تصویر اُس میں

عورت

(فنونِ لطیفہ کی دنیا میں)

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے
مصوّر کی نظر میں اُس کی تصویریں پریشاں ہیں
ادب کی محفلوں میں اُس کی تنویریں پریشاں ہیں
مُغنّی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے
نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے

نقوشِ آب و گِل میں اُس کی تصویریں پریشاں ہیں
صنم سازوں کے دل میں اُس کی تصویریں پریشاں ہیں
حریمِ رنگ و بُو میں نشّہ بن کر لہلہاتی ہے

ہر اک تصویر کے رنگوں میں نکہت اُس کی آوارہ
حسین اور خوشنما اشعار، شاداب اُس کے نغموں سے
ہمارے بربطوں کے تار بیخواب اُس کے نغموں سے
بُتوں کے مرمریں پردوں میں رنگت اُس کی آوارہ
غرض جب تک یہ دُنیا اور اُس کی خوشنمائی ہے
ہماری زندگانی بھر یہ عورت کی خدائی ہے

لالۂ صحرا

بہارِ صبحِ عریانی ہے، جسمِ یاسمیں اُس کا
لباسِ سادہ ہے تزئین کی صورت سے بیگانہ
یہ صحرائی حسینہ ہے، ہر اک زینت سے بیگانہ
نہیں ممنون غازہ کا، جمالِ دل نشیں اُس کا
معرّا ہے ہر آرائش سے حُسنِ نازنیں اُس کا
تکلّف سے بری اور ناز کی عادت سے بیگانہ
ہر اک رنگیں نظر، غمزے کی کیفیّت سے بیگانہ
مگر ہے عشق سے لبریز، قلبِ آتشیں اُس کا

محبّت، جب کسی کے جذبِ دل کو گدگداتی ہے

نہیں کرتی ہے نذرِ شہر و صحرا ماہتاب آسا

چلی آتی ہے ہر دوشیزہ کے دل میں حجاب آسا

اور آ کر ساز کے تاروں کی تہ میں مُسکراتی ہے

فضا میں موجزن، نغمات کا نظّارہ ہوتا ہے

اور ایک اک نغمہ، سوز و عشق کا گہوارہ ہوتا ہے

نوائے غیب

مجھے تاروں کی آبادی سے اک آواز آتی ہے
کوئی کرنوں کے بربط پر سنہری گیت گاتا ہے
اور اپنے گیت سے خوابیدہ دُنیا کو جگاتا ہے
فضاؤں میں بہارِ کیف و نکہت مُسکراتی ہے
خدائی سلسبیلِ بے خودی میں ڈوب جاتی ہے
یہ نغمہ روح کے پردوں کو جا کر گدگداتا ہے
اور اپنی مست لے میں یہ سندیسہ لے کر آتا ہے
کہ فطرت اپنے شعرستان میں مجھ کو بُلاتی ہے

یہ کون آباد ہے ان روشن و رنگیں ستاروں میں؟

ہے کس کا نورِ عریاں کہکشاں کی شاہراہوں پہ؟

ہیں کس کے نغمے رقصاں ان طلائی جلوہ گاہوں پہ؟

یہ کس کی نے چھپی ہے بربطِ انجم کے تاروں میں؟

یہ کس کے جلوے مضطر ہیں قمر کے آبگینے میں؟

یہ کون آ کر سمایا جا رہا ہے میرے سینے میں؟

اسلامی مطبوعات
مترجم و معرا، عکسی و لیتھو، صحیح و خوش خط
قرآن مجید
حمائل شریف
تفاسیر قرآن پاک
اقتصادی، علمی، ادبی اور اخلاقی کتابیں
ناول
افسانے
دیوان
طلبا کے لئے بہترین ٹیکسٹ بکس
فہرست مفت طلب کریں
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ کشمیری بازار۔ لاہور